خدا وہ وقت نہ لائے

''سنو یاور! تم نے کبھی وہ کوئلہ دیکھا ہے جو بظاہر تو بجھ گیا ہو لیکن اس کے اندر ایک چنگاری سلگتی ہو۔ اس کوئلے کے اوپر سفید راکھ کا غلاف چڑھ جاتا ہے' ایسا ہی ایک غلاف میرے احساسات پر چڑھ گیا ہے' راکھ جیسا غلاف اور ایسی ہی ایک چنگاری میرے اندر دہکتی ہے جو کسی کو دکھائی نہیں دیتی۔ جس کی تپش ایک میری رگ جاں کے سوائے کسی تک نہیں پہنچتی جو سلگتی ہے بجھتی ہے' پھر سلگتی ہے' جیسے کوئی اسے اپنے آنچل سے ہوا دیتا ہو۔ جیسے کوئی اسے بھڑکتے اور جلتے رہنے پر مجبور کرتا ہو۔ سنو یاور! یا تو میں ایسا بھڑکوں گا کہ ہر شے کو جلا کر راکھ کر دوں گا یا پھر یوں بجھ جاؤں گا کہ میرا پورا وجود سفید راکھ میں تبدیل ہو جائے گا اور تمہارا دوست سکندر تمہیں کبھی نہیں مل سکے گا۔''

قلم اس کی سرد انگلیوں میں دبے دبے برف کے ٹکڑے جتنا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ میز پر کھلا ہوا خط چاروں طرف سے حملہ آور ہوتی برفانی ہواؤں سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ لیکن خط کا دامن اس کے ہاتھ کے نیچے دبا ہوا تھا۔ خط وہ مکمل کر چکا تھا۔ بس نیچے نام لکھنا باقی رہ گیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا لکھے اور کیسے لکھے۔ ''فقط تمہارا دوست سکندر بخت۔'' کتنے آسان الفاظ تھے جو اسے تحریر کرنے

تھے اور اسے یہ چند حروف لکھنا دنیا کا مشکل ترین کام لگ رہا تھا۔

"دنیا سے تو ذلیل ہوتے آئے ہیں لیکن اپنا تمسخر آپ اڑانا۔ کیا مشکل کام ہے سکندر بخت۔ واہ رکھنے والے نے کیا نام رکھا ہے' ایسا نام جسے ضابطۂ تحریر میں لانا عذاب ہو جائے۔ ساری دنیا ہنستی' مضحکہ اڑاتی محسوس ہو۔ ماں۔ کوئی بھلا سا نام رکھا ہوتا۔ سیاہ بخت' بد بخت یا پھر کم بخت۔ کم از کم اسم بامسمیٰ تو ہوتے۔ یہ سکندر بخت لکھنا تو بڑا مشکل کام ٹھہرا ہے۔ بدن کا سارا خون شرم سے پانی ہو جاتا ہے اور پھر ہر رگ سے یہ پانی آنکھوں کی سمت رواں ہو جاتا ہے۔ کانوں میں ہنسی کی' تمسخر سے بھرپور سیٹیوں کی اتنی آوازیں گونجتی ہیں کہ دماغ کی رگیں درد کرنے لگتی ہیں۔ پھٹنے لگتی ہیں اور اس شور میں صاف سنائی دیتا ہے' سیاہ بخت' بد بخت۔ کم بخت۔"

"سکندر بھائی! آپ سوئے نہیں؟"

دروازہ کھول کر حسنہ باہر آئی تھی' برابر کے صحن سے آتی مٹیالی روشنی میں اسے کچھ پڑھتا دیکھ کر وہ ٹھٹکی تھی' اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہ تھا' سو وہ خاموش بیٹھا رہا۔

"توبہ۔ توبہ۔ کتنی سردی ہے۔" وہ خود سے ٹکراتی ہواؤں سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"مر جائیں گے سکندر بھائی! سو جائیں اب جا کر' اماں نے دیکھ لیا تو پند و نصائح کا رجسٹر کھول لیں گی رات کے دو بجے بھی۔"

بڑبڑ کرتی وہ ٹوائلٹ کی جانب بڑھ گئی۔

اس نے لکھی ہوئی تحریر کو ایک نظر دیکھا۔ بند کر کے لفافے میں رکھا اور اٹھ کر صحن سے متصل برآمدے میں آ گیا' جہاں ایک کونے میں اس کا بستر لگا ہوا تھا۔ صحن اور برآمدے کے درمیان جو چق لگی ہوئی تھی' وہ کافی شکستہ اور بوسیدہ تھی اور کڑکتی سردیوں میں ہوائیں بلا تکلف اندر داخل ہو جایا کرتی تھیں۔ سکندر کو سردیاں سخت ناپسند تھیں۔ سردیوں کا آغاز ہوتے ہی پیٹی صندوق سے اس کا وہی سال خوردہ زخمی لحاف نکلوا کر چھت پر ڈلوا دیا کرتی تھیں' تاکہ اس کی بو مر جائے۔ لیکن وہ بدبو اس لحاف میں کچھ یونہی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ کئی سال کی ریاضت کے بعد اسے روئی پر اس قدر تصرف حاصل ہوا تھا کہ وہ اس کے ریشے ریشے میں بس سکتی تھی۔ بھلا چند دن مرجھائی ہوئی دھوپ میں پڑے رہنے سے اس کا کیا بگڑ سکتا تھا اور بات صرف اس بدبو کی ہی نہیں تھی۔ بات اتنا

ہزار ہا شگافوں کی بھی تھی' جو ایک ایک کر کے اس کہن زدہ لحاف کے جسم پر نمودار ہو چکے تھے۔ ہوا کی برچھیاں ان شگافوں سے گھستیں اور سکندر کے بدن کو چھید ڈالنے کے درپے ہو جایا کرتیں۔ اس کی ساری رات کروٹ بدلتے' لحاف کو ڈبل' ٹرپل کر کے اوڑھنے اور جسم کو مکمل طور پر ڈھکنے کی کوششیں کرنے میں صرف ہوتی اور صبح اس کا عضو عضو اکڑن اور درد محسوس کرتا تھا۔ دن میں اس کے پاس پہننے کے لئے جو سویٹر تھا وہ پانچ برس قبل چچا میاں ریٹائر کر چکے تھے اور سویٹر کی اس ریٹائرمنٹ کی وجہ یہ تھی کہ وہ پورے طور پر سرد ہواؤں کا مقابلہ نہیں کر پاتا تھا۔ چچی نے بصد محبت وہ سویٹر اسے عطا کر دیا۔

''ارے تمہارے چچا کا تو ہے دماغ خراب۔ بھلا کیا خرابی ہے اس میں۔ نہ کوئی سوراخ ہوا نہ ڈھیلا پڑا۔ چلو وہ تو ٹھہرے بڑی عمر کے' لگتی ہو گی انہیں زیادہ سردی۔ ایسا کرو یہ تم لے لو۔ میں تو کہتی ہوں' یہ گرم بھی خوب ہے' ذرا تھام کر دیکھو' ہاتھ جلانے لگتا ہے' ارے تمہارے چچا کا تو ہے دماغ خراب۔''

دماغ کی خرابی کی یہ تصدیق اس کے لئے بھی ہو سکتی تھی اگر وہ سویٹر لینے سے انکار کرتا تو۔ سو اس نے خاموشی سے ان کے ہاتھ جلاتا وہ سویٹر ان سے لے لیا۔ ویسے بھی کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر تھا۔ اس کا پرانا سویٹر کئی جگہوں سے ادھڑ چکا تھا۔ چنانچہ پچھلے پانچ برسوں سے چچی سردیاں شروع ہوتے ہی صندوق سے اس کا لحاف اور گرم کپڑوں کے بکس سے اس کا سویٹر نکال دیا کرتی تھیں۔

ایسے میں سردیاں اسے بری نہ لگتیں تو اور کیا ہوتا۔

بستر پر لیٹ کر اس نے حسب معمول لحاف سے کچھ جنگ لڑی اور پھر ہارے ہوئے لشکر کی طرح دم سادھ کر پڑ گیا۔

زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا
دنیا سے خامشی سے گزر جائیں ہم تو کیا

آنکھیں کھول کر اس نے ہر سو بکھرے اندھیرے کو دیکھا اور تلخی سے مسکرا دیا۔ سرد سرد برچھیاں ہر جانب سے حملہ آور تھیں۔

☆☆☆

اگلی صبح وہ کالج جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا جب وہ سٹور میں آئی۔ ''سنو سکندر! ذرا سٹاپ تک چھوڑ آؤ۔ آصف مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

''چلو۔'' اس نے جلدی جلدی سویٹر پہنا اور اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

''امی! میں آج ذرا دیر سے لوٹوں گی۔'' باورچی خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے ماں کو اطلاع دی۔

''بھئی زیادہ دیر مت لگانا۔ تمہارے ابا میاں مجھ پر خفا ہوتے ہیں۔'' چچی کو بیٹی کی فراہم کردہ اطلاع ناگوار گزری۔

''عندلیب! دیر سے مت آیا کرو۔'' سڑک پر اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ آہستگی سے بولا۔ ''دوپہر کو یہ علاقہ بالکل سنسان ہو جایا کرتا ہے۔ اکیلی لڑکیوں کے لئے یہ جگہ خطرناک ہے۔''

''ہوں۔ ٹھیک ہے۔'' وہ بے دلی سے گویا ہوئی۔

''کہاں جانا ہے جو دیر سے آنے کا کہہ رہی ہو؟'' وہ اندر سے غیر مطمئن تھا۔ پھر پوچھ بیٹھا۔

''دوست کے ساتھ جانا ہے۔'' اس نے بادل نخواستہ جواب دیا۔

''مجھے پتا سمجھا دو۔ میں لینے آ جاؤں گا۔''

''دیکھو سکندر! مجھے یہ چھوٹی چھوٹی باتوں' چھوٹے چھوٹے واقعات پر لایعنی بحث کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میں نے کہا نا میں خود آ جاؤں گی۔ میں کوئی بچی نہیں ہوں۔''

سٹاپ پر بس چلنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ وہ بات مکمل کرتے ہی چڑھ گئی۔ بہت سے خدشے' بہت سے واہم' بہت سے استفسار اس کے اندر مچلتے رہ گئے' بس کو دور تک جاتے اس نے دیکھا اور پھر جیبوں میں ہاتھ ڈال کر واپس چل دیا اور اگر وہ کچھ دیر ٹھہر بھی جاتی تب بھی وہ سارے خدشے' استفسار اس کے اندر ہی رہتے۔ سوچوں کو الفاظ کا پیراہن وہ صرف ایک ہستی کے سامنے دیتا تھا۔ یاور جو اس کا دوست نہیں' اس کا ہمزاد تھا۔ اپنے دل کی ہر بات' کاندھوں کو شل کرتا ہر بوجھ وہ اس کے سامنے رکھ دیا کرتا تھا اور وہ کمال مہربانی سے پورا نہیں تو آدھا بوجھ ضرور ہلکا کرتا تھا۔ ان دونوں نے زندگی میں کئی چیزیں شیئر کی تھیں۔ دکھ' ملال' آنسو' درد۔ ان کا ہر جذبہ' احساس سانجھا

تھا۔ دو ماہ پیشتر اس کا داخلہ این ای ڈی میں ہو گیا تھا اور سکندر کو جتنی خوشی ہوئی تھی اتنا ہی دکھ بھی ہوا تھا۔ خوشی دوست کا مستقبل روشن ہو جانے پر ہوئی تھی اور دکھ نہارہ جانے پر۔

"مجھے خط لکھا کرنا سکندر۔ تفصیلی خط۔" بیگ کندھے پر لٹکائے اٹیچی کیس اٹھائے وہ دور سے آتی ٹرین کو دیکھتے ہوئے جلدی جلدی بول رہا تھا۔ "ایک ایک بات' ایک ایک سوچ مجھے لفافے میں بند کر کے بھیجنا۔ تمہاری سوچوں کے بغیر میرا دماغ ادھورا رہتا ہے۔"

اور سکندر اُسے خط لکھتے ہوئے خود کو گلی میں بنے چبوترے پر بیٹھا ہوا محسوس کرتا۔ وہ رات گئے تک اسی چبوترے پر بیٹھ کر باتیں کرنے کے عادی تھے' سکندر خیالوں میں اس چبوترے پر جا پہنچتا اور ایک ایک سوچ کو کاغذ پر منتقل کرتا جاتا۔

"یاور! کبھی کبھی دل میں انتہائی شدت سے وجود سے عدم میں تبدیل ہو جانے کی خواہش ابھرتی ہے' تم تو سمندر کے انتہائی قریب رہتے ہو۔ کبھی ساحل پر جاؤ تو اس موج کو غور سے دیکھنا جو چپ چاپ خاموشی سے سر جھکائے آتی ہے اور تمہارے قدموں سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کے ٹوٹنے کی آواز تمہارے کانوں تک نہ آتی ہو گی مگر یاور! ایسی موجیں بے آواز نہیں ٹوٹتیں' کبھی میرے دل تک آؤ اور ان ٹوٹتی' بکھرتی لہروں کا ماتم سنو۔ شور محض طوفان کا خاصا نہیں۔ خاموش' بے چاری سی لہروں میں بھی ہزاروں طوفان پوشیدہ ہوتے ہیں۔ تم تو میری بات سمجھتے ہو نا......"

یاور اس کے خطوط کا جواب نہیں دیا کرتا تھا۔ ایسا کرنے سے اسے سکندر نے ہی منع کیا تھا۔ وہ اس کی پڑھائی میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لئے ہر ہفتے وہ خود تو اسے خط بھیجتا تھا لیکن خط میں جواب نہ دینے کی تاکید بھی کر دیا کرتا تھا۔

"جب تم چھٹیوں میں آؤ تو صرف تم بولنا اور میں چپ چاپ تمہاری باتیں سنوں گا۔ اس طرح ہمارا معاملہ بیلنس ہو جائے گا۔"

وہ اسے اکثر یہ جملہ لکھتا تھا۔ یاور کو گئے دو ماہ ہو چکے تھے اور ان دو مہینوں میں وہ محض دو بار ہی حیدر آباد آیا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ یاور کے آنے پر جتنی بار ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان ملاقاتوں کے دوران بھی صرف سکندر ہی بولتا رہتا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ اس کے

پاس بولنے کے لئے بہت کچھ تھا' بات دراصل یہ تھی کہ اس کے پاس اپنے دل کی باتیں کہنے کے لئے محض ایک ہی دوست تھا۔ یاور اس کا واحد سامع تھا۔ یاور کے پاس بیٹھتے ہی وہ سکندر جو عام حالات میں گونگے پن کی حد تک خاموش رہتا تھا' ریڈیو کی طرح بجنا شروع کر دیتا۔ یاور اس کا سامع' غمگسار اور ناصح تھا۔

''سنو سکندر! یہ محبت جو ہے نا۔ یہ ون وے روڈ ہے۔ اس پر چلنا شروع کرو' تو یہ سوچ کر چلنا کہ اس راہ کا کوئی سرا کوئی اختتام نہیں جسے تم اپنی منزل قرار دے سکو اور یہ سوچ کر چلنا کہ ضروری نہیں دوسری جانب سے بھی کسی کے قدم تمہاری سمت اٹھ رہے ہوں۔'' وہ اسے سمجھایا کرتا تھا۔ ''دل کے منہ زور گھوڑے پر اگر ایک بار تم سوار ہو گئے تو یہ تمہیں اپنی مرضی سے چلائے گا۔ پھر خواہ تم وحشت کے صحراؤں میں جا نکلو یا ناکامیوں کے سمندر میں ڈوب جاؤ۔ یہ منہ زور گھوڑا اپنی لگامیں کسی کے ہاتھ میں نہیں دیتا۔''

اور وہ سوچتا۔ یاور ٹھیک کہتا تھا۔ یہ ابلق بے لگام شاید اسے وحشت کے صحراؤں کی جانب اڑائے لئے جا رہا تھا' وہ خود کو بے بس' لاچار محسوس کرنے لگا تھا۔ جس وادئ پرخار میں قدم رکھنے سے اسے یاور نے منع کیا تھا۔ وہ اسی وادی میں داخل بھی ہو چکا تھا اور پاؤں زخمی کئے کسی نخل سایہ دار کی تلاش میں بھی تھا۔

''میں اسے اتنا چاہنے لگا ہوں یاور! کہ میری اپنی زندگی میری نگاہ میں بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے۔ اس دنیا میں سود و بیاج پر کتنے سودے ہوتے ہیں نا۔ کیا کوئی میری زندگی رہن رکھ کر مجھے میری من پسند خوشیاں نہیں دے سکتا؟!''

یاور نے اس کی بات سن کر اپنا سر تھام لیا تھا۔

''میں نے تمہیں کتنا سمجھایا تھا سکندر۔''

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا' کوئی غم گسار ہوتا!

اور یاور اسے دیکھ کر بے چارگی سے مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

زندگی اس کے لئے محرومی کا دوسرا نام تھا اور اس کی محرومیوں کی ابتدا اس وقت ہوئی تھی

جب اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ ہوش سنبھالنے پر جو گھر اسے اپنے اردگرد نظر آیا تھا' وہ چچا میاں کا تھا۔ چچا میاں کی شادی کو بارہ برس گزر چکے تھے اور بے اولادی نے انہیں سکندر بخت کو اپنے بڑے بھائی سے مانگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سکندر کی ماں اس کی پیدائش کے چند ماہ بعد ہی کسی موذی بیماری کا شکار ہو کر مر گئی تھی۔ اس سے بڑے پانچ بھائی پہلے ہی باپ کے کاندھوں کا بوجھ تھے۔ ان کی پڑھائی' دوا دارو اور دیگر اخراجات ہی کچھ کم نہیں تھے' لہٰذا اس نے سکندر بخت کو بخوشی چھوٹے بھائی اور اس کی بیوی کے سپرد کر دیا۔ یوں بھی وہ کوئی غیر نہیں تھے' ان کے درمیان خون کا' محبت کا بڑا گہرا رشتہ تھا اور اس رشتے نے سکندر کے باپ کو بھائی اور بھاوج پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کر لینے کا حوصلہ بخش دیا تھا۔ سکندر چچا میاں کے ساتھ حیدر آباد آ گیا۔ تین سال تک ان دونوں نے درحقیقت اسے ماں اور باپ بن کر پالا۔ اسے اکلوتی اولاد جیسی محبت دی گئی لیکن سکندر اس گھر میں تنہا نہیں آیا تھا۔ اپنے نام کے تمام تر اثرات اس وقت اس کے ساتھ تھے' تین سال بعد چچی کی گود ہری ہو گئی اور عندلیب احمد اس کی محبتوں میں حصہ دار بن کر چلی آئی۔ پھر آصف' حسنہ' شہناز اور آصف کے بعد دیگرے محبتوں میں شراکت دار بن کر آتے چلے گئے اور آخر کار سکندر بخت کے پاس کچھ بھی نہ بچا۔ نہ وہ پہلا سا بخت' نہ وہ پہلی سی محبتیں۔ چچی نے جو کچھ دیا تھا۔ وہ سب واپس لے کر اپنی سگی اولادوں میں تقسیم کر دیا اور چچا میاں گھبرا کر جو غم روزگار میں گم ہوئے تو انہیں پلٹ کر کسی کو ایک نظر دیکھ لینے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ وہ نظر انداز ہو گیا اور پھر اسے نظر انداز ہوتے رہنے کی عادت پڑ گئی۔ اسے اعلیٰ تعلیم دلانے اور روشن مستقبل دینے کی باتیں کرنے والے چچا میاں نے چپ چاپ سرکاری سکول میں ڈال دیا لیکن یہاں وہ کچھ شکایت کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس کے اپنے سگے بھائی بھی دوسرے شہر میں سرکاری سکولوں میں ہی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لیکن بات صرف سرکاری سکولوں' پرانی کتابوں اور دوسری محدود ضروریات زندگی کی ہی نہیں تھی' اس کے بعد پھر یوں ہوا کہ اسے گھر کے زائد کاموں کو نبٹانے والا نوکر سمجھ لیا گیا اور اس میں اصل اور بنیادی غلطی یا کوتاہی چچی کی تھی۔ ان کے نکالے ہوئے انداز کو اس گھر کا دستور سمجھ لیا گیا۔ وہ سکول سے آتا تو باہر کے کاموں کی ایک طویل لسٹ اس کی منتظر ہوتی۔

"سکندر! یہ لا دو۔ سکندر وہ لا دو۔ ارے میری عقل پہ خدا کی مار' دہی منگوانا تو بھول ہی گئی۔ جا بچے ذرا دوڑ کر لے آ......"

وہ بازار کے چکر لگا لگا کر ہلکان ہو جاتا۔ پھر چچا میاں دکان سے لوٹتے اور ان کے کاموں کا آغاز ہو جاتا۔ وہ جو اشیائے خوردنی کے چکروں سے فارغ ہو کر بیٹھا ہوتا' پان اور سگریٹ لانے کے لئے گھن چکر بن جاتا۔ شروع شروع میں یہ بات اس کے لئے اتنی تشویش کا یا الجھن کا باعث ہرگز نہیں تھی لیکن پھر اس نے دیکھا' واصف بھی اس قدر قابل تو ضرور تھا کہ اگر وہ دو مرتبہ بازار سے ہو آیا ہے تو تیسری مرتبہ وہ چلا جائے لیکن تیسری تو کیا چوتھی اور پانچویں مرتبہ بھی اسے ہی پکارا جاتا۔ یہ وہ پہلا مقام تھا جہاں اس نے اس گھر میں اپنا اور واصف کا فرق جاننا چاہا اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ گھر' وہ ماں باپ' وہ بہن بھائی جنہیں وہ اب تک اپنا سمجھتا آیا تھا۔ وہ درحقیقت واصف کے ہی تھے اور وہ خود چچا میاں کی جلد بازی میں کی گئی غلطی تھی۔ تب اس نے خود میں محصور ہونا سیکھا۔ اپنے درد' اپنی سوچوں کو خود تک محدود رکھنا سیکھا اور آہستہ آہستہ وہ ان سب سے الگ ہوتا چلا گیا۔ اسے علم بھی نہ ہو سکا کہ کب وہ آصف کے سمجھدار ہو جانے پر واصف کے کمرے سے نکالا گیا' کب اس کا پلنگ پہلے ڈرائنگ روم اور پھر برآمدے میں لا ڈالا گیا۔ کب اس کے پڑھنے کی میز صحن میں اس طرح لگائی گئی کہ وہاں زیادہ دھوپ وغیرہ نہ آئے اور وہ کم از کم شام کو وہاں بیٹھ کر پڑھ سکے۔ اسے کسی بات کا بھی علم نہ ہوا اور وہ مکمل طور پر ان لوگوں سے الگ ہو گیا۔ پھر اسے یاور ملا۔ وہ بھی اپنی ماں کے فوت ہونے پر اپنی نانی کے پاس آ کر رہنے لگا تھا اور اس کی نانی کا گھر چچا میاں کے گھر کے بالکل سامنے تھا۔ دونوں کا سکول اور کلاس بھی ایک تھی اسی لئے بہت جلد دونوں میں دانت کاٹے کی دوستی ہو گئی۔ یاور کو شروع شروع میں سوال کرنے کی بہت عادت تھی اور اسی عادت نے سکندر کو بہت سی باتوں کا احساس دلایا تھا۔ ان باتوں کا ادراک بخشا تھا۔ جن کی اسے خبر ہی نہیں تھا۔

اس نے پوچھا تھا۔

''تم تو انہیں چچا میاں کہتے ہو۔ کیا یہ تمہارے سگے چچا ہیں؟''

''ہاں بالکل سگے۔ میرے ابا کے چھوٹے بھائی۔''

''پھر یہ تمہارے ساتھ نوکروں کا سا برتاؤ کیوں کرتے ہیں؟ واصف بھی تو ان کا بیٹا ہے۔ سارے کام یہ لوگ تم سے ہی کیوں کرواتے ہیں؟''

وہ خاموش ہو کر سوچنے پر مجبور ہوا تھا اور پھر کئی دنوں تک سوچتا رہا تھا۔ یاور نے ایک

دن اس سے پوچھا تھا۔

''یار...... تمہارا پلنگ باہر برآمدے میں کیوں ہے؟ تم واصف اور آصف کے کمرے میں کیوں نہیں شیئر کرتے؟''

'ان کا کمرا چھوٹا ہے۔ دو آدمیوں کے لئے ہی مناسب ہے۔'' اس نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔

''تب بھی تمہیں اس کمرے میں ہونا چاہئے۔ تم ان دونوں سے بڑے ہو۔ علیحدہ کمرے کی زیادہ ضرورت تمہیں ہے۔''

''کبھی تم اپنے گھر گئے ہو' اپنے ابا کے گھر؟'' ایک بار اس نے پوچھا۔

''ہاں گیا تھا ایک سال کے لئے۔ ابا ایک دن مجھ سے ملنے یہاں آئے تو میں سردی میں اکیلا صحن میں بیٹھ کر پڑھ رہا تھا۔ باقی سب لوگ اندر کمروں میں تھے۔ ابا مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ لیکن وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ گھر ابا کا نہیں رہا' وہ میرے بھائیوں میں بٹ گیا ہے۔ بڑے دو بھائیوں کی شادی ہو چکی ہے اور وہ اپنے کمروں کو اپنا علیحدہ علیحدہ گھر بنا چکے ہیں۔ ان کا جینا مرنا' غمی خوشی ان کے کمروں تک محدود ہو گئی ہے۔ باقی تین بھائی بھی اپنی اپنی زندگی میں گم ہیں۔ میرا وجود ان میں سے کسی کے لئے بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں وہاں رہوں یا نہ رہوں' ان میں سے کسی کو بھی اس بات سے غرض نہیں اور پھر وہ پانچوں تو بچپن سے ساتھ پلے بڑھے تھے۔ جب ان میں آپس میں محبت اور اتفاق نہیں تھے تو مجھے وہاں کون خاطر میں لاتا؟ میں تقریباً ایک سال وہاں رہا۔ پھر ایک دن چچا میاں آئے اور ابا سے معافی تلافی کر کے مجھے واپس یہاں لے آئے۔''

''کیوں؟''

''ان کے گھر کے کام رک گئے ہوں گے۔'' یاور نے وثوق سے کہا۔

اور سکندر سر جھکا کر ہنس دیا۔

یاور نے اسے اپنا سمجھا' اس کا دکھ درد بانٹا۔ اس کی محرومیوں کو شیئر کیا۔ اسے جینے کا حوصلہ دیا۔ وہ یاور کو دوست ہی نہیں محسن مانتا تھا۔ وہ اسے آئینہ میں زندگی کا چہرہ بھی دکھاتا تھا اور پھر اس کی بدصورتی سے لڑنے کا حوصلہ بھی دیتا تھا۔

کالج کے زمانے میں سکندر کے پاس اکثر ٹیوشن کے لئے فیس نہیں ہوتی تھی۔

''ارے بھئی! رکھا ہی کیا ہے ان ٹیوشن میں.......'' چچی کہتیں۔ ''وہی سب پڑھیو تو کالج میں بھی بتاتے ہیں۔ ذرا کوئی دھیان دے کر پڑھے تو ٹیوشن کی بھلا کیا ضرورت۔ میں تو کہتی ہوں سکندر بیٹا! فضول خرچی ہے یہ ٹیوشن ویوشن۔ تم تو گھر میں پڑھا کرو۔ یہ برابر کی گلی میں کباڑی رہتا ہے۔ ایسی اچھی اچھی کتابیں ملتی ہیں اس کے پاس۔ تم اسی سے لے آیا کرو۔ ارے آج کل تو بندہ کتابیں خریدے یا پیٹ بھر کر روٹی کھائے۔ اے ہاں۔'' یاور نے کئی بار اس کی فیس بھری۔

ان کے محلے میں ہیلتھ کلب قائم کیا گیا۔ محلے کے سارے لڑکے باقاعدگی سے وہاں جانے لگے' سکندر کے دل میں زندگی میں شاید پہلی بار کسی خواہش نے جنم لیا تھا۔ بڑی خواہش تھی اسے مضبوط' کسرتی بدن کی۔ چوڑے چکلے سینے اور بازوؤں میں ابھرتی مچھلیوں کا تصور اسے بڑا خوبصورت لگتا تھا۔ ہیلتھ کلب کی فیس برائے نام تھی۔ لیکن چچا میاں نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔

''ارے بھائی! میری کپڑوں کی چھوٹی سی دکان ہے' کاٹن مل نہیں ہے' میں دو وقت کی روٹی مشکل سے کمار ہا ہوں' تمہیں فضولیات سوجھتی رہتی ہیں' جاؤ' پڑھو جا کر۔''

یاور پھر اس کے کام آیا۔ وہ اپنی بھی فیس بھرتا اور اس کی بھی۔ یاور کا باپ اسے ہر ماہ معقول رقم بھیجتا تھا۔

وہ دونوں ہیلتھ کلب باقاعدگی سے جانے لگے اور چند ہی مہینوں میں اس کا بدن شاندار ہو گیا۔ شکل وصورت بھلی تھی ہی' وہ ہالی وڈ کی فلموں کا ہیرو لگنے لگا لیکن تعجب اسے اس وقت ہوا جب چچا میاں نے واصف اور آصف کو بھی ہیلتھ کلب جانے کی تلقین کرتے ہوئے فیس تھمائی۔

''دیکھو ذرا' اپنے سکندر نے کیسا بدن بنا لیا ہے۔'' وہ خوش ہو کر چچی سے بھی کہہ رہے تھے' اس کا دل خوش ہونے کے بجائے اندھیروں میں اترتا چلا گیا۔ اس کے شوق کو فضولیات قرار دینے والے چچا میاں نے اسی شوق کو اپنے بیٹوں کی ضروریات میں سے سمجھا۔ وہ کافی دن گم سم سا رہا۔ اسے قدم قدم پر احساس دلایا جاتا تھا کہ وہ ان میں سے نہیں تھا۔ وہ اس گھر کا فرد نہیں تھا۔ وہ باہر کا شخص تھا اور یہی وہ احساس تھا جس کی وجہ سے نہ وہ چچا میاں اور چچی کو اپنے ماں باپ کے مقام پر دیکھ سکا اور نہ ان کی اولادوں میں بہن بھائیوں کی محبت ڈھونڈ سکا۔ اس کے لئے زندگی

تھی ایک مثلث تھی جس کے ایک سرے پر وہ تھا دوسرے سرے پر اس کی تنہائیاں اور تیسرے سرے پر یاور لیکن نجانے کب کہاں اور کیسے اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کی زندگی مثلث سے مستطیل کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ کہیں خود بخود ایک سرا اپنا ابھرنے کا اپنے وجود کا احساس دلا رہا تھا اور پھر وہ سرا پوری طرح ابھر کر اس کے سامنے چلا آیا۔ اس سرے پر عندلیب کھڑی تھی۔ اپنی تمام تر رعنائیوں اور تمکنت کے ساتھ۔ سکندر کے لئے زندگی کا محور وہ سرا اہم ہو گیا۔ باقی تینوں سرے کہیں پس منظر میں چلے گئے۔ زندگی نے ایک سیدھی طویل راہ کی صورت اختیار کر لی اور اس طویل راہ پر دکھ ہی دکھ خار ہی خار بچھے تھے۔ وہ ہمیشہ یاور کی بات مان لیا کرتا تھا لیکن یہاں یاور بھی اس کے کسی کام نہ آیا۔ وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنی پری تمثال کزن کی محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔

☆☆☆

وہ کالج سے لوٹا تو گھر میں کوئی نہ تھا۔ برآمدے میں اس کے پلنگ سے ذرا فاصلے پر بچھے تخت پر چچی لیٹی بے خبر سو رہی تھیں۔ اس نے کوفت کے عالم میں کتابیں رکھیں اور گھر میں کسی کے موجود نہ ہونے کا سبب سوچنے لگا۔ حسنہ اسے کالج سے واپسی پر کھانا نکال کر دیتی تھی اور اس وقت وہ کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے اور باورچی خانے میں چلا آیا۔ آنتیں قل ہو اللہ کا ورد کر رہی تھیں۔ ایک ایک کر کے اس نے سارے پتیلے دیکھ لئے۔ سالن کا کہیں کوئی نام و نشان نہ تھا۔ مایوس ہو کر باہر نکل آیا۔ صحن میں بنے زینے پر چھت سے پہلے چھوٹا سا سٹور نما کمرا بنا ہوا تھا۔ وہاں سے اسے کچھ کھسر پھسر کرنے کی آوازیں آئیں تو وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اندر عندلیب تھی۔ کالج سے واپس آ کر اس نے یونیفارم بھی تبدیل نہ کیا تھا۔ سفید شلوار پر چیک کی میرون قمیض پہنے سارے بال چہرے پر بکھرائے وہ انتہائی توجہ سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ سکندر نے فرش پر آرام سے بیٹھی ہوئی وہ لڑکی اسے عندلیب نہیں کوئی اور ہی لگی۔ عندلیب جیسی نفاست پسند اور نک سک سے رہنے والی لڑکی کو اس حالت میں دیکھ کر اسے بڑا تعجب ہوا۔

"عندلیب!"

"آں ... ہاں!" وہ بری طرح سے چونکی اور لاشعوری طور پر کاغذ کا لفافہ پشت کے چھپا لیا۔

"یہاں......اس قدر گھٹن اور گندگی میں بیٹھی کیا لکھ رہی ہو؟" وہ سخت حیران تھا۔

"کچھ نہیں...... میں وہ......" وہ ہکلا کر رہ گئی۔ "میں یہاں کچھ پرانی کتابیں ڈھونڈ رہی تھی۔ انہیں بکسوں میں رکھی تھیں میں نے۔"

"اچھا......" وہ ہنوز حالت تعجب میں تھا۔ "حسنہ، شہناز، آصف کہاں ہیں یہ سب لوگ؟"

"حسنہ اور شہناز اپنی دوست کے گھر گئی ہیں۔ میلاد شریف میں۔ آصف شاید بازار گیا ہے کچھ خریدنے۔"

اس کے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ اس کے وہاں کھڑے رہنے سے کوفت محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے کھانا چاہیے......" اس نے اصل بات بیان کی۔

"کھانا...... وہ دراصل اماں کی طبیعت خراب تھی۔ انہوں نے کچھ نہیں پکایا۔ رات کا سالن پڑا تھا۔ میں نے اور آصف نے وہ کھالیا۔"

"پھر......؟" وہ حیران تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ وہ بھوکا پیاسا کالج سے لوٹا تھا۔ کتنے آرام سے وہ سالن نہ ہونے کی وضاحت کر رہی تھی۔

"پھر......" وہ بیزاری سے پہلو بدل کر بولی۔ "انڈے لے آؤ اور تل کر کھالو۔ میں ذرا مصروف ہوں پلیز......"

اس نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ لڑکی اس سے اس قدر بے زار اتنی نالاں کیوں رہتی تھی اور اس کے یہ تو قطعاً سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس لڑکی میں ایسا کیا تھا جو اسے مقناطیس بن کر کشش کرتا تھا۔ اس کے خیالات، احساسات برقی رو کی طرح اس بے مہر کی جانب کیوں بہتے تھے، بہت سی باتیں اس کی سمجھ سے قطعاً باہر تھیں۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ بیگانگی سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی گویا وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے رہی تھی۔ وہ مڑا اور ایک ایک سیڑھی اترتا نیچے آ گیا۔ چند لمحوں قبل تک پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اور اب اس کی بھوک قطعاً مر چکی تھی۔ اس گھر میں کون اس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتا تھا۔ کون اس سے عزت سے پیش آتا تھا اور کون نہیں۔ اسے اس بات کا نہ احساس تھا نہ پرواہ لیکن جب عندلیب اس

طرح سے پیش آتی تو وہ خود کو بے حد مضمحل' بے حد پژمردہ محسوس کرتا تھا۔ ایسے میں اسے یاور ٹوٹ کر یاد آیا کرتا۔

بغیر کچھ کھائے پیئے وہ پلنگ پر لیٹ گیا اور سوچتے' کڑھتے نجانے کب نیند کی وادیوں میں اتر گیا۔

☆☆☆

یاور! تم وہ مہربان ہو جو دنیا کی ہر بے مہری پر ٹوٹ کر یاد آتے ہو۔ اس وقت رات کے دو بجے کا عمل ہے' ساری دنیا گرم لحافوں میں لپٹی سپنوں کے نرم و نازک تار بن رہی ہے اور میں خون جماتی سخت سردی میں آنگن میں بیٹھا تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔

یاور! جب تم یہاں آؤ تو مجھے یہ بتانا کہ اس دنیا میں کسی شخص کی محبتوں کے جواب میں محبت نہ سہی' محض ذرا سی مروت دینے سے بھی لوگ کیوں کتراتے ہیں؟ یاور مجھے بتانا کہ کسی کی ذرا سی توجہ' ذرا سی مسکراہٹ حاصل کرنے کے لئے کون سے پل صراط طے کرنے ہوتے ہیں؟

تم جانتے ہو یاور! تم نے اسے دیکھا ہے' تم اس سے ملے ہو' تم نے اس سے باتیں کی ہیں۔ مجھے بتاؤ نا یاور اس میں ایسی کون سی خاص بات ہے جو مجھ سا عام شخص اس سے بات کرنے' اسے مخاطب کرنے تک کا حق نہیں رکھتا۔ مجھے بتاؤ نا کہ میری صورت' میرے جسم' میری سیرت' میری عادت میں کہاں وہ کون سی برائی ہے' جو مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے ماتھے پر تیوری پڑ جاتی ہے۔

یاور! مجھے بتاؤ' مجھے سمجھاؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ زندگی نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ کچھ بھی نہیں' لیکن مجھے وہ نہ ملی تو یہ ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔ ہر چند کہ وہ میری نہیں ہے لیکن میں اسے پائے بغیر بھی اسے کھونے کا تصور نہیں کر سکتا۔ عجب شے ہے یہ عشق بھی' انسان کو اس کا بنا دیتا ہے جو انسان کا اپنا نہیں ہوتا۔

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب، عشق اختیار کیا !!!

تمہارا دوست

سکندر

اس کا بی کام پارٹ ون کا رزلٹ آیا تھا اور وہ سارے پیپرز کلیئر کر گیا تھا۔ اس کے مارکس بھی اچھے خاصے تھے۔ بغیر کتابوں' بغیر کسی ٹیوشن اور بغیر کسی کی مدد کے اس نے جس طرح سے تھرڈ ایئر گزارا تھا وہ اس کا دل جانتا تھا۔ نوٹس بورڈ پر آویزاں شیٹ دیکھ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔

کالج سے گھر تک کا فاصلہ اس نے گویا ہواؤں میں اڑتے ہوئے طے کیا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا وہ دروازے پر لٹکا پردہ ہٹا کر اندر گھسا اور سامنے سے آتی عندلیب سے ٹکرا گیا۔ دونوں کے ہاتھوں سے کتابیں گر کر فرش پر بکھر گئیں۔

''معاف کرنا عندلیب! میں خوشی میں بغیر دیکھے بھاگے چلا آ رہا تھا۔''

دونوں بیٹھ کر اپنی اپنی کتابیں اٹھانے لگے تو وہ خوش دلی سے بولا۔ وہ خاموشی سے اپنی کتابیں اکٹھی کرتی رہی۔ سکندر نے ایک نگاہ اس کے تنے ہوئے چہرے پر ڈالی اور اس کا دل یک بارگی بجھ گیا۔ اس نے جان بوجھ کر تو یہ حرکت نہیں کی تھی۔

''سنو عندلیب!''

دونوں کھڑے ہوئے تو اس نے بے تابی سے آواز دے ڈالی۔

''کہو۔'' وہ بیزاری سے مڑی۔

''میرا رزلٹ آ گیا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں نے سارے پیپرز کلیئر کر لئے ہیں۔''

''مبارک ہو۔'' رکھائی سے کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

وہ اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اسے اپنی آنکھوں کے گوشے نم محسوس ہوئے۔ پہلی بار اس کے حلق میں کڑواہٹیں اتریں' اسے شدت سے اپنی بے مائیگی کا احساس ہوا۔ کتنی بڑی خوشی تھی یہ اس کے لئے۔ اس کا جی چاہتا تھا ایک ایک شخص کو پکڑ پکڑ کر بتائے اور سب سے پہلا سب سے اہم ہستی نے جو رسپانس دیا تھا' اس نے اسے اندر تک کاٹ کر رکھ دیا تھا۔ وہ

ہولے ہولے چلتا اندر آ گیا۔ چچی جان تخت پر بیٹھی پالک صاف کر رہی تھیں۔

''السلام علیکم چچی!'' وہ آہستگی سے بولا۔

''جیتے رہو!''

''چچی! میرا رزلٹ آ گیا ہے' میں پاس ہو گیا ہوں۔''

''چلو خیر کی خدا نے!'' وہ اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہیں۔ ''اب اگلی جماعت میں جاؤ گے۔''

''جی!'' وہ اٹھ کر اندر آ گیا۔

حسنہ اور شہناز بیٹھی لڈو کھیل رہی تھیں۔

''السلام علیکم' سکندر بھائی!'' دونوں باجماعت بولیں۔

''وعلیکم السلام!''

وہ تھوڑی دیر بیٹھا انہیں تکتا رہا۔

''حسنہ' شہناز میرا رزلٹ آ گیا ہے۔ میں پاس ہو گیا ہوں۔'' نجانے کس موہوم سی خواہش کے پیش نظر وہ بول پڑا تھا۔

''سچ بھائی!'' دونوں معصوم بچیاں خوش ہو گئیں۔ ''مٹھائی کھلائیں۔ نہیں نہیں آئس کریم کھلائیں۔''

دونوں لڈو چھوڑ چھاڑ کر اس کے سر پر آ کھڑی ہوئیں۔ اس کے اندر پہلی پھوار پڑی۔ جلتے' پکتے دل کے لئے محبتیں کسی بھی صورت میں ٹھنڈا مرہم' نرم پھوار ثابت ہوتی ہیں۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کا واحد نوٹ نکالا۔ یہ اس کا اگلے پورے ہفتے کا کالج جانے کا کرایہ تھا۔

''یہ لو! میرے پاس بس یہی پیسے ہیں۔ جو ملے گا ان پیسوں میں وہی کھا لینا۔'' وہ خفت سے ہنسا۔

''تھینک یو سکندر بھائی۔'' حسنہ نے دس کا نوٹ اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور دونوں کھلکھلاتی ہوئی باہر کی جانب بھاگ گئیں۔

وہ وہیں بیٹھا انسان کی حقیقت پر غور کرتا رہا۔ رویوں کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کتنی خواہش تھی اس کی۔ کوئی اس کے سر پر دست شفقت پھیرتا' کسی کے نرم لب اس

کے ماتھے کو بوسہ دیتے' اسے آئندہ زندگی میں کامیابیاں حاصل کرتے رہنے کی دعائیں دیتے' کسی کے نرم حنائی ہاتھ اس کے لئے دعائیں مانگنے کے لئے اٹھا کرتے' زندگی کی کوئی خوشی تو اس کی اپنی ہوتی' کوئی ایک شخص تو کسی طور پر اس سے وابستہ ہوتا۔

وہ وہیں لیٹے لیٹے سو گیا۔ کسی کو اس کے لئے کھانا لانے کا خیال تک نہ آیا تھا۔ وہ خوابوں میں خود کو نجانے کیا کیا کھاتے دیکھتا رہا۔ نجانے کس کے ہمراہ پھرتا رہا۔

جی میں پھرتا ہے میر وہ میرے
جاگتا ہوں کہ خواب کرتا ہوں

☆☆☆

شام کو چچا میاں آئے تو وہ سلام کرکے ان کے پاس آ بیٹھا۔

''اور سناؤ' پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔'' وہ ہمیشہ اس سے گفتگو کی ابتدا یونہی کیا کرتے تھے۔

—— ''جی چچا میاں! خدا کا فضل ہے۔ آج میرا رزلٹ آ گیا ہے۔ اچھے مارکس آئے ہیں میرے۔''

''ہوں!'' انہوں نے متانت سے سر ہلایا۔

ایک ان کا ردعمل دیکھنا ہی باقی رہ گیا تھا۔ سو اس نے دیکھ لیا۔

''چچا میاں! فائنل کے لئے فیس جمع کروانی ہے۔'' وہ دبی زبان سے بولا۔ وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔

''ایک ہفتے کا وقت ملا ہے!! اگلے اتوار کو لاسٹ ڈیٹ ہے۔''

ایسے موقعوں پر وہ ہمیشہ اپنے باپ کو اور اس کی لاتعلقی اور بے حسی کو یاد کیا کرتا تھا۔

''کتنی فیس ہے؟''

''آٹھ سو روپے۔'' اس نے سر جھکا کر بتایا۔

''نہ بھئی نہ۔'' وہ یکدم بھڑک اٹھے۔ ''میں کہاں سے اتنا خرچہ اٹھاؤں۔ تمہارے جتنے لڑکے تو نوکریاں کرکے ماں باپ کا بوجھ ہلکا کیا کرتے ہیں اور تمہاری پڑھائیاں پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ تمہیں چاہئے کہ ٹیوشن پڑھاؤ اور اپنا خرچہ اٹھاؤ لیکن میاں شاید تم چچا کو باپ کی جگہ ہی نہیں

رنہ پائے۔ تم سوچتے ہو گا کہ اپنا خون بوڑھے چچا کے لئے جلاؤ۔ مفت کی جب تک ملے کام چلتا رہے۔ بیٹا اب عمر یہ آ گئی ہے کہ خود بھی کھاؤ اور ہمیں بھی کھلاؤ۔ تمہاری تو میں فیسیں بھر بھر کر تنگ آ گیا ہوں۔''

وہ اٹھے اور سپٹر کرتے' آستینیں چڑھاتے' وضو کے لئے چوکی پر جا بیٹھے۔ وہ اپنی جگہ دم بخود بیٹھا رہ گیا۔ آج جو کچھ چچا میاں نے اسے کہا تھا اس نے سکندر کا سارا خون اس کی رگوں میں جما ڈالا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا انہوں نے کن فیسوں کا ذکر کیا تھا؟ اسے یاد تھا اس کی میٹرک کی فیس جس وقت بھری جا رہی تھی' چچا سخت بیمار پڑے ہوئے تھے اور اس کی کسی طور فیس مانگنے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ یاور نے اپنے باپ کو خط لکھ کر پیسے منگوائے تھے اور اس کی فیس بھری تھی۔ سرکاری سکول اور سرکاری کالج میں ہر مہینے برائے نام فیس بھری جاتی تھی۔ کتابیں تو وہ سدا دوسروں سے مانگ کر پڑھتا رہا تھا۔ تھوڑی بہت جو پاکٹ منی ملتی تھی' اسے بچا بچا کر رکھتا اور ضرورت پڑنے پر کاپیاں اور رجسٹر وغیرہ خرید لیا کرتا تھا۔ ایسے میں جب اسے چچا میاں نے یہ طعنہ دیا تو وہ بہت دیر تک کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہ رہا پھر وہ آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ باورچی خانے میں چچی غایت درجے کی بے نیازی سے روٹیاں پکا رہی تھیں۔ سکندر کے ذہن میں ایک لمحے کے لئے کچھ خیال گزرا۔

''شاید چچی کی وجہ سے۔''

پھر اس نے سر جھٹکا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

رات کافی بیت چکی تھی۔ وہ پلنگ پر سیدھا لیٹا چھت کی جانب دیکھ رہا تھا' پے در پے بہت سی باتیں ایسی ہوئی تھیں کہ اب وہ اس گھر میں اپنا مقام اور اس گھر کے لوگوں سے اپنے رشتے اور اس کی حدود کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ اس گھر میں کیوں لایا گیا تھا۔ اس سے اسے کچھ سروکار نہ تھا لیکن وہ اس گھر میں کیوں رہتا تھا' اسے یہ سوچنا تھا۔

اندر کی جانب سے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ اس نے سنی پھر اسے ایک ہیولی سا دکھائی دیا۔

''سکندر!''

"جی چچا میاں!" وہ اٹھ بیٹھا۔

"یہ تمہاری فیس کے پیسے ہیں' کل جمع کروا دینا۔" انہوں نے اس کے ہاتھ میں نوٹ تھمائے اور لوٹ گئے۔

"چچا میاں" اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔

نوٹ اس کے ٹھنڈے برف ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے اور اس کا دل اندر ہی اندر ڈوب رہا تھا۔ وہ بچپن سے اس گھر میں تھا اسے یہاں بیٹا بنا کر لایا گیا تھا۔ پھر وہ اتنا بے قیمت' اتنا بے مول کیسے ہو گیا تھا کہ اس کی فیس کے پیسے چچا میاں کو چھپ کر دینے پڑتے۔

آصف اور واصف کی طرح وہ کیوں اپنی فیس لڑ جھگڑ کر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اسے بیٹا بنا کر لانے والوں نے اسے نوکر کب بنا ڈالا تھا۔ اسے انمول سمجھ کر حاصل کرنے والوں نے اسے بے مول کب قرار دے دیا تھا۔ یہ سارے فیصلے اندر ہی اندر کب ہوئے تھے؟ اور اگر ہو چکے تھے تو پھر سکندر کو بھی کچھ فیصلے کرنے تھے۔

ساری رات جاگ کر' کروٹیں بدل کر اس نے بھی ایک فیصلہ کیا اور مطمئن ہو کر سپیدۂ سحر نمودار ہوتے وقت سو گیا۔

☆☆☆

وہ سو کر اٹھا تو چچا ناشتہ کر کے دکان جا چکے تھے۔ اس نے ہاتھ منہ دھو کر پہلا کام یہ کیا۔ کہ ان کے دیئے ہوئے پیسے ان کی الماری میں سامنے ہی رکھ دیئے۔ پھر وہ ناشتہ کئے بغیر گھر سے نکل گیا۔ اسے ایک ضروری شخص سے ملنا تھا۔

"انیس بھائی! آپ سے ذرا ایک کام تھا!"

انیس بھائی ہیلتھ کلب کے نگران تھے۔ کسی زمانے میں پہلوانی کرتے تھے۔ ایک سیاسی تنظیم سے بھی وابستہ رہ چکے تھے۔ محلے میں سب ان کے اثر و رسوخ سے واقف تھے۔

"اوہ! آؤ میری جان! یہ آج ہمارا چاند صبح کے وقت کیسے نکل آیا ہے؟" انہوں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ مارا اور اسے لے کر کلب کے اندرونی حصے میں آ گئے۔

"کام وام چھوڑو۔ پہلے یہ بتاؤ ناشتہ کرو گے؟"

"جی!" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہوں شاباش۔ او یار کاکے! ناشتہ تو لے آ۔''

انہوں نے کسی کو آواز دی۔

انیس بھائی ہمیشہ اس پر انتہائی مہربان رہتے تھے۔ وجہ سکندر خود بھی نہیں جانتا تھا۔ نجانے کیوں وہ اس سے کمال درجے شفقت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ دوسرے لڑکوں کو تو وہ معمولی معمولی سی بات پر دھنک کر رکھ دیا کرتے اور کسی میں لب کشائی کی جرأت نہ ہوا کرتی تھی۔

''ہاں بیٹا! اب بول۔'' ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اس کی جانب متوجہ ہوئے۔

''انیس بھائی! میرا ایک کام کر دیں۔ میں ساری زندگی احسان مند رہوں گا۔''

''اوہ گولی مارو احسان مندی کو۔ تم کام بولو!''

''مجھے نوکری چاہیے!''

''کیسی نوکری؟''

''کیسی ہی نوکری کیوں نہ ہو۔ بس حلال کے دو پیسے ملتے ہوں۔''

''ہوں! ڈرائیوری کرو گے؟'' وہ فوراً بولے۔

''جی؟'' اس نے تعجب سے ان کی شکل دیکھی۔

''دیکھو! میرے ایک جاننے والے ہیں۔ بڑے پیسے والے لوگ ہیں' انہیں ایک بااعتماد ڈرائیور کی ضرورت ہے۔''

''لیکن انیس بھائی مجھے تو ڈرائیونگ نہیں آتی۔ نہ میرے پاس لائسنس' نہ تجربہ' میں بھلا یہ کام کیسے کر سکتا ہوں؟''

''وہ تم انیس بھائی پر چھوڑ دو۔ گاڑی چلانا میں تمہیں ہفتہ بھر میں سکھا دوں گا۔ باقی ہر چیز میرے ذمے۔ یہ کہو شان تو نہیں گھٹے گی؟ تمہارے جیسے بالشت بالشت بھر کے چھوکرے دو جماعتیں پڑھ کر خود کو چیف منسٹر سے کم نہیں سمجھتے!''

وہ ہنس دیا۔

''چیف منسٹر کیا انیس بھائی! ہم خود کو پرائم منسٹر بھی سمجھیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ رہیں گے تو وہی بالشت بھر کے بے قیمت چھوکرے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں تو میں راضی ہوں۔'' اتنی جلدی اپنا کام بن جانے پر وہ خود بھی حیران تھا۔

''بس تو پھر شام سے میرے پاس آنے لگو، ہفتہ بھر بعد میں تمہیں لے چلوں گا، ہاں۔''

''میں... میں ہفتہ بھر میں سیکھ سکوں گا؟''

''ارے تمہارا باپ بھی سیکھ لے گا!'' وہ جوش سے بولے۔

اسے ہنسی آ گئی تھی۔

☆☆☆

جس عالی شان کوٹھی پر انیس بھائی اسے لے کر گئے تھے اسے باہر سے دیکھتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی یہ شان و شوکت نہ دیکھی تھی۔ اندر پورٹیکو میں لائن سے چار چمچماتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ملازم کی ہمراہی میں وہ دونوں آراستہ و پیراستہ وسیع ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔

''بیٹھو سکندر!'' انیس بھائی نے بیٹھتے ہوئے اسے بھی اشارہ کیا۔ اس نے قیمتی صوفوں کو ایک نظر دیکھا اور کھڑا ہی رہا۔

''بیٹھو بیٹا!'' انہوں نے اس کا تامل دیکھ کر ہنس کر کہا۔

وہ بادل نخواستہ ایک صوفے کے کنارے پر ٹک گیا۔

''ہیلو انکل!'' بجلی کی رفتار سے وہ اندر داخل ہوئی تھی۔

سکندر گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

''آپ ڈرائیور لے آئے ہیں۔'' وہ انیس بھائی سے مخاطب تھی۔ ''اتنے دن بعد؟ کب سے میں ڈیڈی کی جان کھا رہی ہوں اور ہر بار وہ مجھے جواب دیتے ہیں کہ انہوں نے آپ سے کہہ رکھا ہے اور آپ بہت اچھا سا ڈرائیور ڈھونڈ کر دیں گے۔ میں دن بھر گھر میں پڑی بور ہوتی رہتی ہوں، جب سے وہ پرانا ڈرائیور نوکری چھوڑ کر گیا ہے، مجھے باہر نکلنے کی پرمیشن نہیں ملتی۔ ڈرائیونگ سیکھنے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ نجانے ڈیڈی کو مجھ سے کس خطرناک ایکسیڈنٹ کی امید ہے جو وہ مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر تک بیٹھنے بھی نہیں دیتے۔'' وہ نان اسٹاپ بولتے بولتے رکی پھر اس کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''اوہ۔ یہ؟ انکل یہ ڈرائیور لائے ہیں آپ؟''

''السلام علیکم!'' وہ جلدی سے بول پڑا۔

''ہوں۔ ٹھیک ہے۔'' وہ دوبارہ انیس بھائی کی جانب متوجہ ہو گئی۔ ''یہ ڈرائیور ہے یا

انگریزی رسالوں سے نکلا ہوا ماڈل؟'' وہ بے تکلفی سے قہقہہ مار کر ہنس دیئے۔

''بیٹا! تم بھی ہمیشہ اپنے جیسی بات کرتی ہو' خوبصورت اور انوکھی۔''

نجانے وہ اس بات کے جواب میں کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس کے وا ہوئے لب اندر داخل ہوتے' گرے بالوں والے باوقار شخص کو دیکھ کر دوبارہ جڑ گئے۔

''السلام علیکم سر جی!'' انیس بھائی بڑے احترام سے کھڑے ہوئے تھے۔

سکندر نے بھی تقلید کی۔

''والسلام!'' انہوں نے دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سامنے بیٹھ گئے۔

''بڑے دن لگا دیئے انیس! ثانی نے مجھے ان چند دنوں میں کتنا اپ سیٹ رکھا ہے۔''

''سر جی! اعتماد کا بندہ ڈھونڈنے میں بھی تو وقت لگتا ہے نا۔ یہ سکندر بخت ہے۔ اسی کو لایا ہوں میں!''

''ہوں!'' انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ ''کتنا تجربہ ہے اسے؟ لگتا تو نو آزمودہ ہے۔''

''اندازہ درست ہے آپ کا سر جی!''

''نہیں انیس۔ یہ نہیں!'' انہوں نے یکلخت فیصلہ دے ڈالا۔ ''یہ کسی طور مناسب نہیں' تم بے شک چند دن اور لے لو۔ کوئی اور بندہ تلاش کر لو۔''

''جی بہتر سر جی!'' وہ سر جھکا کر بولے۔

سکندر کے اوپر منوں اوس آ گری۔ کتنی محنت' کتنی لگن سے اس نے ڈرائیونگ سیکھی تھی۔ کتنے کتنے گھنٹے پریکٹس کی تھی اور اس شخص نے کتنی آسانی سے اسے ریجیکٹ کر دیا تھا۔ اسے احساس ہوا' وہ واقعی اس دنیا میں بہت حقیر سا وجود لے کر آیا تھا۔

انیس بھائی نے اٹھ کر اس شخص سے ہاتھ ملایا۔ سکندر کی اتنی بھی ہمت نہ ہوئی' سر جھکا کر بولے سے سلام کر لینے پر ہی اکتفا کر کے وہ باہر نکل آیا۔ آتے آتے ایک بار اس کی نظر اس لڑکی سے دوچار ہوئی تھی۔ نگاہوں میں دلچسپی بھرے نچلا لب شرارت سے دانتوں میں دبائے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ گویا اس کا وجود کوئی عجوبہ تھا۔ بلیو جینز اور سرخ ٹی شرٹ میں ملبوس اس کی وہ جھلک سکندر کے دماغ سے چپکی رہی۔ ہرچند کہ اس کی نظروں میں حقارت یا طنز نہ تھا لیکن وہ جو خود کو دل و دماغ کی تمام تر شدتوں سے حقیر' بے مایہ اور کمتر سمجھنے لگا تھا' اسے اب ہر نگاہ یکساں لگتی تھی۔

"بیٹا! بددل مت ہو۔" باہر نکل کر انیس بھائی نے اس کی کمر تھپکی۔ "یہ نہ سہی کچھ اور سہی۔ اصل میں یہ حیات خان صاحب کچھ الگ مزاج کے آدمی ہیں۔ کبھی مٹی کو سونا سمجھ لیتے ہیں کبھی سونے کو مٹی کر دیتے ہیں یا شاید انہیں تمہاری عمر پر اعتراض ہو۔ یہ جوان کی بیٹی ہے نا ثانیہ۔ کچھ عجب طبیعت کی لڑکی ہے۔ آزاد خیال اور آزاد منش، فکر مند رہتے ہیں اس کی طرف سے۔ شاید اسی خیال سے انہوں نے تمہیں رکھنے میں تامل کیا ہو۔ خاص الخاص ثانیہ کو ہی تو ضرورت ہے ڈرائیور کی۔"

"آپ کیسے جانتے ہیں ان لوگوں کو؟" اس نے دھیان بٹانے کے لئے سوال کیا۔

"کسی زمانے میں سیاست میں ہوتے تھے خان صاحب۔" "میں باڈی گارڈ تھا ان کا۔ پندرہ سال نوکری کی ہے میں نے ان کی۔ بڑا اعتبار کرتے ہیں مجھ پر، دیکھا نہیں ثانیہ مجھے انکل کہتی ہے؟" انہوں نے فخر سے کہا۔ گویا ثانیہ کا ان کو انکل پکارنا ان کے لئے بڑی شان کا باعث تھا۔

وہ سڑک پر پڑے پتھروں کو ٹھوکروں سے اڑاتا چلتا رہا۔ فی الوقت دنیا کی کوئی شئے کوئی تذکرہ اس کے لئے دلچسپی کا باعث نہ تھا۔

"میں جلد ہی کوئی انتظام کر دوں گا تمہارا!"

رخصت ہوتے وقت انہوں نے اسے تسلی دی۔

"جی!"

اس نے آہستگی سے کہا اور ہاتھ ملا کر چلا آیا۔

☆☆☆

زندگی کی چیونٹی کی سی رفتار میں یکلخت تیزی کی ایک لہر آئی تھی۔ یاور پندرہ دن کی چھٹیوں پر آیا ہوا تھا۔ موسم بھی بہار کا تھا اور سکندر کے لئے بہار در بہار کا موسم تھا۔

"میں تو بھول ہی گیا تھا کہ دنیا میں، میں قطعاً تنہا نہیں ہوں۔" وہ بہت دیر تک اس سے لپٹا رہا۔

"میرا ایک یار بھی ہے۔"

"کیسی گزاری؟" وہ علیحدہ ہوا۔

"سب کچھ لکھتا تو رہا ہوں تمہیں۔" سکندر پھیکی سی ہنسی ہنسا۔ "مزید کیا حال بتاؤں۔"

"تمہارے خطوط سے تو لگتا تھا کہ نیلیں زرد روشنائی سے تحریر کئے گئے خطوط ہیں۔ اتنی اداسی اتنی دل گیری! یار شرم کرو سکندر! جوان آدمی ہو۔"

"اداسی اور دل گیری بڑھاپے سے مشروط ہے؟" وہ مسکرایا۔

"نہیں۔ لیکن جوانی میں ملنے والے دکھ درد انسان مسکرا کر پی جاتا ہے۔"

"حوصلے عمر سے نہیں احساس تنہائی سے ٹوٹتے ہیں یاور! دکھوں سے ٹوٹتے شانوں پر جب کسی ہمدرد کی محبت ہاتھ نہ رکھے تو بھلا کہاں کی ہمت اور کیسا حوصلہ۔ کس کے لئے جئے انسان کس کی خاطر نبرد آزما رہے؟"

"تم نے اسے آزمایا تو نہیں ہے ناں سکندر! پھر یہ پیشگی مایوسی کیا معنی رکھتی ہے۔"

"آزماؤں تو تب جب وہ مجھے اتنا حق دے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔ "مجھے اس کو نہیں اپنی قسمت کو آزمانا ہے جس نے مجھے کبھی ذرا سی تسلی نہیں دی۔"

"ایک مشورہ دوں سکندر!" یاور نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ مت کہنا کہ اس کا خیال دل سے نکال دوں۔"

"پھر کیا کہوں؟ یار سکندر!" وہ زچ ہوا۔

"مت چل اس راہ پر یار! آگے کچھ نہیں ہے' کچھ بھی نہیں۔"

"پھر بھی یاور پھر بھی' میرے پاس ایک کھوٹا پیسہ بھی نہیں لیکن یہ جوا میں ہر حال میں کھیلوں گا۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

دونوں کے درمیان خاموشی کا مختصر سا لمحہ آیا۔

"اونے بے غیرت۔" پھر یاور نے اچانک ماحول تبدیل دیا۔ "اتنے آرام سے بیٹھا ہے۔ پاس ہونے کی نہ خبر دی نہ منہ ہی میٹھا کرایا۔ مگر میں اتنا بے خبر نہیں ہوں۔"

"چھوڑو یار۔" اس نے سر جھٹکا۔ "چھوڑ دیا ہے میں نے پڑھنے لکھنے کا خیال!"

"ہائیں.... وہ کیوں؟ دماغ تو ٹھکانے ہے محترم کا؟"

"یار! نہیں دیا جاتا مجھ سے فقیروں کی طرح۔ اب مفت کی روٹیاں توڑتے شرم آتی ہے مجھے۔ پھر کرنا کیا چاہتا ہوں میں.... بی بی سی۔" وہ سخت جھلایا ہوا تھا۔

''ہوا کیا ہے؟'' اس نے نرمی سے پوچھا۔

سکندر نے اسے فیس مانگنے سے لے کر واپس رکھ دینے تک کی تمام داستان سنا ڈالی۔

''تھوڑا ذلیل اور ہولو سکندر! کم از کم تمہاری گریجوایشن تو ہو جائے۔''

''چھوڑو یار! کیسی گریجوایشن۔ ایک بے کار سی ڈگری سے اب بھی کیا مل جائے گا۔''

''اور جب ایک بے کار سی ڈگری بھی پلے نہ ہوگی تو پھر کیا کرو گے؟''

''پتھر کوٹوں گا' سڑکیں بناؤں گا۔'' وہ از حد تلخ ہو رہا تھا۔

''چاچا اپنی لاڈلی بیٹی کا رشتہ ایک مزدور کو ہرگز نہیں دیں گے۔'' یاور نے مسکرا کر اس کی تلخی مذاق میں اڑانی چاہی۔

وہ خاموش بیٹھا انگلی سے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہا۔

''مجھے مزدور بنانے کا سہرا بھی چچا کے سر ہی ہوگا۔'' پھر اس نے خاموشی توڑی۔

''سکندر! تم اپنے باپ کے پاس!''

''یاور پلیز! آگے کچھ مت کہنا۔ جو باپ مجھے پیدا کر کے بھول گیا۔ میں بھی جیتے جی کبھی اسے نہیں پکاروں گا اور تم ٹھیک کہتے ہو' میں جوان آدمی ہوں اور اس جوانی میں اور کچھ نہ ہو انا ضرور ہوتی ہے۔''

''سکندر یار! میں تجھے زندگی میں بہت کچھ بنتے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' یاور بے چارگی سے بولا۔

ہستی ہی اپنی کیا ہے زمانے کے سامنے
اک خواب ہیں جہاں میں بکھر جائیں ہم تو کیا!

وہ اداسی سے مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

''سکندر!''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بلیک کاٹن کے سوٹ پر پرنٹڈ دوپٹہ اوڑھے سلیقے سے چوٹی بنا کر آئے نازلے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ہاں کہو۔۔۔ کچھ کام ہے؟''

''ہوں!'' اس نے اضطراب سے ہاتھ مسلے۔ ''وہ ذرا مجھے ٹیکسی لا دو۔''

''کہاں جاؤ گی؟''

وہ اٹھ کر شرٹ پتلون کے اندر کرنے لگا۔

''دوست کے ہاں جاؤں گی۔ اماں گھر پر نہیں ہیں۔ وہ آئیں تو تم انہیں بتا دینا پلیز۔''

سکندر نے ذرا غور سے اس کی اتری ہوئی صورت دیکھی۔

''عندلیب! تمہیں چچی جان سے پوچھ لینا چاہئے تھا۔''

''ہاں ہاں! میں آ کر انہیں بتا دوں گی۔ وہ اصل میں مجھے صبح پوچھنا یاد نہیں رہا۔''

وہ خلاف توقع بڑی نرمی سے بات کر رہی تھی۔ سیاہ لباس میں اس کی ملیح رنگت بڑا خوبصورت تاثر دے رہی تھی۔ ہمیشہ سادہ رہنے والی عندلیب آج بڑے اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔ ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک جمی تھی۔ آنکھیں آئی لائنر اور مسکارا سے سجی ہوئی تھیں۔

سکندر باوجود کوشش کے اس پر سے جلد نظر نہ ہٹا سکا۔ اس نے محسوس کیا۔ اس کے دیکھنے سے عندلیب کے گال لمحہ بھر کے لئے لو دے اٹھے تھے۔

''جلدی جاؤ نا پلیز۔'' اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ ٹیکسی لے کر وہ آیا تو وہ دروازے پر ہی کھڑی تھی۔

''تم اکیلی جاؤ گی؟ میں چلوں تمہارے ساتھ؟''

''نہیں نہیں شکریہ!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''میں تو عادی ہوں' معمول کی بات ہے۔''

پھر وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا دی۔

''میں جلدی لوٹ آؤں گی' اماں کو بتا دینا۔ ہاں!''

''ہوں!'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس کے جانے کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا اس کی موجودگی کو محسوس کرتا رہا۔ وہ دن کتنا حسین کتنا خوبصورت تھا۔ روشن' چمکدار' عندلیب کی مسکراہٹ سے بھرا ہوا۔

اسے ہر سو وہ مسکراہٹ بکھرتی نظر آتی رہی دو آنکھیں چمکتی دکھائی دیتی رہیں۔ اس کے ارد گرد اجالے اترتے رہے' جگنو بکھرتے رہے۔

''یاور! یاور! آج میں بہت خوش ہوں بہت خوش!'' رات کو یاور سے ملاقات پر اس

نے اسے گود میں اٹھالیا۔

''کیا ادھر سے اظہار ہو گیا ہے؟'' وہ گھبرا کر پوچھ بیٹھا۔

''ارے!'' وہ زور سے ہنس دیا۔ ''اس دن تو میں خوشی سے مر جاؤں گا۔''

''پھر کیا ہوا ہے؟''

بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے!

یاور احمقوں کی طرح اسے گھورتا رہا۔

☆☆☆

دوپہر سے اس کی طبیعت بوجھل بوجھل سی تھی۔ موسم کے بدلنے کا اثر ظاہر ہو رہا تھا۔ سر درد کی وجہ سے وہ خاموشی سے چادر لئے بیٹھا ہوا تھا۔

اندر کوئی ہمسائی کافی دیر سے بیٹھی اپنی کرخت آواز میں زمانے بھر کے حالات پر سیر حاصل تبصرہ کر رہی تھیں اور ان کی آواز اسے سخت بری محسوس ہو رہی تھی۔ دل پر جبر کئے وہ خاموشی سے لیٹے رہنے پر مجبور تھا۔

''ارے بہن! یہ لڑکیاں تو ککڑی کی بیل ہوتی ہیں۔''

غالباً انہوں نے سکول سے آئی حسنہ اور شہناز کو دیکھ کر بات شروع کی تھی۔

''کل یہی بچیاں مٹی کے برتنوں سے کھیلا کرتی تھیں، آج ہانڈی روٹی سنبھال رکھی ہے۔''

''ہوں۔ ٹھیک کہتی ہو۔!''

چچی کے لہجے کی بیزاری کہتی تھی کہ انہیں اپنی بیٹیوں تک چلے آنے والے تبصرے سے اب الجھن محسوس ہو رہی تھی۔

''اب اپنی عندلیب بیٹی کو دیکھو۔ ماشاء اللہ کیسی سیانی ہو گئی ہے۔ ناک نقشہ بھی اچھا نکل آیا ہے کہیں منگنی ونگنی کی؟''

''ابھی کہاں۔'' چچی نے بات ٹالی۔ ''ابھی تو پڑھ رہی ہے۔''

''اے تو کیا منگنی کے لئے بھی پڑھائی ختم ہونے کا انتظار کرو گی؟ کہیں ہینکا نے سے تو!

’’......جوان لڑکی ہے۔‘‘

’’اے ہاں۔ دیکھوں گی۔ کوئی اچھا ڈھنگ کا رشتہ بھی تو آئے نا۔‘‘ چچی بھنا سی گئی۔

’’ہاں ہاں بہن! جو کرنا دیکھ بھال کر کرنا۔ ویسے یہ تمہارا بھتیجا کیا کرتا ہے؟‘‘

’’خاک کرتا ہے۔‘‘ جہاں سے سکندر نے گفتگو کو بغور سننا شروع کیا وہیں چچی جان جل کر خاک ہوئی تھیں۔

’’شکل و صورت کا اچھا ہے۔‘‘ چچی کے انداز پر ہمسائی دبک گئیں۔ ’’میں نے تو اس لئے کہہ دیا۔‘‘

’’اے بی بی! تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ جس دن کسی قابل ہو گیا میں تمہاری بیٹی کا ہاتھ مانگ لوں گی تم سے۔ میری بیٹیوں کو رشتوں کی کمی نہیں۔‘‘

’’نہ بھئی۔ جسے اپنے نہ دیں' اس پر بھلا پرائے کیا بھروسہ کریں گے۔‘‘ ہمسائی نے پاؤں پلنگ سے اتار کر چپلیں ٹٹولیں۔ ’’میں نے تو یونہی کہہ دیا۔ اچھا بھائی کہا سنا معاف کر دینا۔ چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔‘‘

’’خدا حافظ۔‘‘ چچی نے لٹھ کھینچ مارا۔

ہمسائی کے چلے جانے کے بعد بھی وہ تادیر بڑبڑاتی رہیں۔

’’اے لو' میری بیٹیوں کی فکر انہیں دبلا کئے جا رہی ہے۔ ہمیں نظر نہیں آتا جو یہ مشورے دینے آن پہنچیں۔ سارے زمانے کے نکھٹو بے کار' مفت خورے میری بیٹیوں کے لئے رہ گئے ہیں۔‘‘

وہ دم سادھے لیٹا رہا۔ سر درد میں یکلخت کئی گنا اضافہ ہو چکا تھا۔ کنپٹیوں پر جیسے کوئی ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ اسے لگا کچھ دیر میں اس کے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی یا اس کی کھوپڑی تڑخ کر دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ چند لمحوں میں اس کا پورا جسم بری طرح پسینوں میں نہا گیا۔

’’کیا زبان سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ نشتر ہے۔ کیا اس سے زیادہ کڑوا اور تلخ' جان لیوا زہر آج تک کسی کو دیا گیا ہے۔ شاید پگھلا ہوا سیسہ سماعتوں کو اتنی تکلیف نہ پہنچاتا جتنی کہ ان الفاظ نے پہنچائی ہے۔‘‘

شدت غم سے اس کا پورا وجود پھنکنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ شدید قسم کے بخار میں مبتلا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''سکندر بھائی۔''

وہ تیسرا دن تھا جب اس کا بخار ٹوٹا...... اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے حسنہ کھڑی تھی۔

''باہر انیس بھائی کھڑے ہیں۔ آپ کو بلا رہے ہیں!''

وہ بمشکل اٹھا اور دیوار کا سہارا لیتا ہوا باہر پہنچا۔

''ارے شیر! یہ کیا حالت ہے؟'' وہ اسے دیکھ کر چونک اٹھے۔

''السلام علیکم انیس بھائی۔'' وہ بمشکل مسکرایا۔

''وعلیکم السلام۔ نصیب دشمناں' یہ کیا حال بنا رکھا ہے' مجنوں کی جانشینی کا ارادہ تو نہیں؟''

''پچھلے تین دن سے بخار تھا۔ آج اترا ہے۔''

''چلو پھر ایک خوشخبری سن لو۔ حیات خان صاحب کا فون آیا تھا۔ تمہارا کونٹیکٹ نمبر مانگ رہے تھے۔ میں نے کہا نمبر وغیرہ تو کچھ نہیں ہے۔ میسج دے دیں۔ بولے اس لڑکے سے کہو کہ کل سے نوکری پر آ جائے۔ بولو خوش؟''

''آپ سچ کہہ رہے ہیں انیس بھائی؟'' اسے یقین نہیں آیا۔

''لو...... آج سے پہلے کتنا جھوٹ بولا ہے تم سے۔'' وہ ناراض ہوئے۔

''تھینک یو انیس بھائی۔ بہت شکریہ۔'' اس نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر ان کا ہاتھ دبایا۔

''میں آج ہی وہاں جاؤں گا۔''

''ارے آج نہیں کل۔ آج تو ریسٹ کرو۔ حلیہ سدھارو اپنا۔''

''ٹھیک ہے...... بہت بہتر!''

وہ اندر آیا۔ بیماری خود بخود رخصت ہو چکی تھی اور وہ خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

اندر چچی کیاریوں کے پاس کھڑی ہاتھ دھو رہی تھی۔

''چچی جان! مجھے نوکری مل گئی ہے۔'' وہ خوشی سے بھرپور لہجہ میں بولا۔ پچھلے دنوں کی کدورت و کثافت خود بخود دل سے دھل گئی تھی۔

''کیا لگ گئے ہو؟'' انہوں نے غور سے اس کی صورت دیکھی۔ وہ پل بھر کو شرمندہ ہوا۔

''جی...... وہ نوکری تو معمولی سی ہے۔ ڈرائیور۔''

''ڈرائیور؟'' وہ طنزیہ انداز میں اس کی بات کاٹ گئیں۔ ''لو بھئی اس کی کسر تھی!'' بڑبڑ کرتی، وہ اندر چلی گئیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ ہر چند کہ بہت کچھ کہنا بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے کسی بڑے مقام پر نہ پہنچ سکا تھا تو اس میں کس کا قصور تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس کی تعلیم اور تربیت کی ذمہ داری کس نے بخوشی قبول کی تھی اور پھر کس حد تک نباہی تھی؟ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ ڈرائیور کی نوکری پر ناک بھوں چڑھانے والی اس خاتون کا تعلق کس شاہی خاندان سے تھا؟ اس کے شوہر کی کپڑے کی کتنی بڑی دکان تھی؟ اس کے بیٹے مستقبل میں کیا کچھ بن سکتے تھے؟ وہ بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن وہ سارے سوال تلخ گھونٹ بن کر اس کے حلق سے اترتے چلے گئے اور ایک حرف بھی شعلہ بن کر باہر نہ آ سکا۔

اگلے روز صبح نو بجے وہ کوٹھی کے مرکزی دروازے پر تھا۔ چوکیدار نے اس کی آمد کی اطلاع اندر بھیج دی تھی اور کچھ دیر بعد ملازم جواب لے کر آ گیا تھا۔

''بی بی جی ابھی سو رہی ہیں۔ ڈرائیور کو اندر بٹھا دو۔'' ساڑھے گیارہ تک وہ بونقوں کی طرح وہاں کرسی ڈالے بیٹھا رہا تا آنکہ اندر سے بلاوا آ گیا۔

وہ پورٹیکو میں چمچماتی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔

''السلام علیکم۔'' اس نے ادب سے سلام کیا۔

''ہوں۔'' اس نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ ''کل تمہیں وردی مل جائے گی۔ اس طرح تو تم ڈرائیور کم میرے بوائے فرینڈ زیادہ لگتے ہو!'' اس بے تکلفی پر وہ قدرے پریشان ہوا۔

''یہ لو چابی۔ دروازہ کھولو۔''

اس نے لپک کر دروازہ کھولا۔ پچھلا ذرا ان لاک کیا اور ادب سے اس کے وا کر دیا۔
وہ بڑی شان اور تمکنت سے براجمان ہوئی تھی۔

''کہاں لے چلوں؟''

''میرا نام ثانیہ ہے۔ تم مجھے ثانی بی بی کہہ سکتے ہو!''

''کہاں لے چلوں ثانیہ بی بی؟''

''فی الحال تو میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کیسی ڈرائیور کرتے ہو۔ گاڑی باہر نکالو اور مین روڈ پر لے چلو۔''

اس کا تجربہ محض دس بارہ دنوں پر محیط تھا۔ اس کی بات سن کر نجانے کیوں اس کے ہاتھوں میں خفیف سی لرزش آ گئی۔ بدقت تمام اس نے گاڑی باہر نکالی اور احتیاط سے ڈرائیو کرتا ہوا مین روڈ پر لے آیا۔ ٹریفک عام دنوں کی نسبت قدرے زیادہ تھی۔

''بیڈ...... ویری بیڈ۔'' وہ دھیرے سے ہنسی تھی۔ ''مسٹر ڈرائیور! کیا نام ہے تمہارا؟''

''سکندر بخت!''

''ہوں۔ اچھا نام ہے۔ مسٹر سکندر۔ کب سے گاڑی چلا رہے ہیں آپ؟''

''آج بارہواں دن ہے جی۔''

''واٹ؟'' وہ حیران ہوئی۔

پھر نجانے کیوں زور سے ہنس دی۔ اس کی ہنسی کی پھوار اس کے اعصاب پر کنکروں کی طرح برس رہی تھی۔ اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت ہلکی پڑی اور گاڑی کسی شرابی کی طرح لہراتی ہوئی ایک درخت سے جا ٹکرائی۔

ہلکی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی پھر وہ بڑی دیر کے لئے خاموش ہو گئی تھی اگر وہ بروقت بریک نہ لگاتا تو حادثہ سنگین صورت بھی اختیار کر سکتا تھا اور اس وقت بھی اسے اپنی نااہلی کا احساس تھا۔

''مسٹر ڈرائیور!'' پھر وہ بولی۔ ''کچھ علم ہے تمہیں تمہارا امتحان کیسا رہا؟''

''آئی ایم سوری ثانیہ بی بی۔'' وہ آہستگی سے بولا۔ ''آپ چاہیں تو فوری طور پر مجھے نوکری سے الگ کر دیں اور چاہیں تو صرف ایک ہفتہ مزید دے دیں۔ میں معمولی سے معمولی نکتہ

بھی سیکھ لوں گا۔"

"اوہ۔ بہت بھروسہ ہے خود پر؟" وہ طنز سے بولی۔ "خیر' کار ریورس کرو اور واپس لے کر چلو۔ فی الحال تو مجھے جان عزیز ہے۔"

آہستگی اور احتیاط سے ڈرائیو کرتا وہ واپس کوٹھی تک گاڑی لے آیا۔

"بس بس یہیں روکو۔" اس نے قدرے فاصلے پر گاڑی رکوالی۔ "اب باہر نکل آؤ۔"

اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی دروازہ کھول کر باہر آ گئی تھی۔

"چابی مجھے دو اور تم گھر جاؤ!"

"لیکن... آپ کو تو ڈرائیو کرنا نہیں آتا۔" وہ تعجب سے بولا۔

"تمہیں آتا ہے؟" وہ پھر زور سے ہنسی۔ اس نے جھینپ کر چابی اس کی جانب بڑھا دی۔

"اب میری بات غور سے سنو۔ ڈرائیونگ مجھے آتی ہے لیکن اس کا علم ڈیڈی کو نہیں ہے۔ لیکن آج میں انہیں بتا دوں گی اور یاد رکھو۔ گاڑی تم سے نہیں مجھ سے بے قابو ہو کر درخت سے ٹکرائی ہے۔ کیا سمجھے؟"

"جی؟" اس نے شدید حیرانی سے اس کی صورت دیکھی۔

"جو کہا ہے بس اسے یاد رکھنا۔ تم یہاں میری پرزور سفارش پر رکھے گئے ہو اور میری ہی شکایت پر نکالے بھی جا سکتے ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ میری سفارش پر رکھا گیا شخص اس قدر نااہلی کا ثبوت دے۔ اس لئے یہ پہلی غلطی میں اپنے سر لے رہی ہوں۔ تم ایک ہفتے بعد آنا اور اپنے دعوے کو درست ثابت کر کے دکھانا' سمجھے؟" ہرچند کہ وہ کچھ بھی نہیں سمجھا تھا پھر بھی اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے سلام کر کے چلا آیا۔

"نجانے دنیا کتنے عجوبوں سے بھری پڑی ہے۔" اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

اس دن کی طرح پھر وہ تیزی سے اندر داخل ہوا تھا اور وہ کتابیں سنبھالے باہر نکل رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس سے ٹکرایا اور اس کی کتابیں فرش پر بکھر گئیں۔

"عندلیب!" اس کی کتابیں اکٹھی کر کے اسے تھما کر وہ بولا۔ "میری جاب کی مبارکباد

نہیں دی تم نے۔"

"مبارک باد۔" وہ دھیرے سے ہنس دی۔ "کیا بننے کی؟ کیا تم اس پھٹیچری جاب کو اپنے کیریئر کا آغاز سمجھتے ہو؟"

"نہیں۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ "زندگی میں جو کچھ میں حاصل کرنا چاہتا ہوں فی الحال تو ایسا کرنے سے وہ سب کچھ میری دسترس سے مزید دور ہو گیا ہے۔ لیکن اس میں کچھ برائی تو نہیں ہے۔ میں تو صرف خود پر سے کچھ مخصوص قسم کے لیبل اتارنا چاہتا ہوں جو وقتاً فوقتاً مجھ پر چسپاں کر دیئے جاتے ہیں۔ میں بہت کچھ بننے کا ارادہ رکھتا ہوں' کچھ عرصے کے لئے ڈرائیور بننے سے میری خواہشات' امنگیں اور حوصلے مر تو نہیں جائیں گے؟"

"پھر؟" وہ قدرے بیزاری کا شکار نظر آنے لگی۔ "کس بات کی مبارکباد چاہتے تھے مجھ سے؟"

"میں تو محض تمہارا ردعمل دیکھنا چاہ رہا تھا!" وہ مسکرا دیا۔ "اس گھر میں ہر شخص مجھ سے خفا سا ہے۔ میرا یہ نوکری کر لینا غالباً چچا کے نام کو بٹہ لگا رہا ہے۔"

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہاری حوصلہ افزائی کروں تو یہ ناممکن ہے۔ میں بھی کچھ ترجیحات رکھتی ہوں اور ایک مخصوص سطح سے نیچے اترنا پسند نہیں کرتی۔" وہ تلخی سے بولی۔

"ایک بات بتاؤ۔ کیا تم مادیت پسند ہو؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا اور یہ سوال پوچھتے وقت اس کی تمام تر کمتری کا احساس اس بری طرح سے چھایا ہوا تھا۔ عندلیب کا انکار میں جواب اس وقت اسے بڑا جذباتی قسم کا حوصلہ بخش سکتا تھا۔

"ہاں۔" لیکن وہ صاف لہجے میں بولی۔ "میں بہت مادیت پسند لڑکی ہوں لیکن آئندہ زندگی اس سے برتر طبقہ میں گزارنا چاہتی ہوں۔ اس سے مزید نیچے آنا میرے لئے ناممکن ہے۔"

پھر وہ اس کے برابر سے گزر کر باہر نکل گئی۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے تادیر وہاں کھڑا رہا۔ اس نے ہر چند کہ کچھ نہیں پوچھا تھا لیکن وہ ہر بات کا جواب دے گئی تھی۔ وہ تمام باتیں جو ان کے درمیان ہوئی تھیں کہے بغیر اپنی وضاحتیں ان دونوں کے ذہنوں پر ثبت کر گئی تھیں۔ سکندر نے چند لفظوں میں سب کچھ کہہ کر سب کچھ پوچھ لیا تھا اور اس نے بڑی فصاحت سے ہر بات کی تشریح کر دی تھی۔

کہنے اور سننے کو غالباً اب کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔

☆☆☆

''یاور! تم نے کہا تھا کہ محبت کی راہ پر چلنے سے پیشتر یہ ضرور باور کر لینا چاہئے کہ ضروری نہیں دوسری سمت سے بھی کسی کے قدم آپ کی طرف بڑھتے ہوں۔ لیکن یہ عجب راہ ہے یاور۔ اس دوسری سمت میں اتنی کشش، اس قدر جاذبیت ہوتی ہے کہ قدم روکنا محال ہوتا ہے اور ہر قدم پر ہزار ہا خوش فہمیاں ست رنگ جال بنتی ہیں لیکن آج ہر جال تار تار ہو گیا ہے ارے رنگ اڑ گئے ہیں اور اب اس راہ پر دور دور تک دھول اور خار دکھائی دیتے ہیں لیکن اس دوسری سمت کی جاذبیت اور کشش روز اول کی طرح برقرار ہے۔

ٹھیک ہی تو ہے۔ ہر شخص کے گرد اس کی خواہشات کا مضبوط جال ہوتا ہے جس میں سے کسی دوسرے کی خاطر نکلنا ہر کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ میری خواہش ہے کہ وہ جو چاہتی ہے اسے مل جائے۔ میں نے خدا سے اپنے لئے کبھی اتنی خوشیاں نہیں مانگی ہیں جتنی اس کے لئے چاہی ہیں۔ اس موقع پر فیض کی ایک نظم یاد آرہی ہے۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا
ہجوم یاس سے بے تاب ہو کے رہ جائے
وفور درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرور حسن سراپا نیاز ہو تیرا

شاید اس نظم کو پڑھ کر تم میری کیفیت محسوس کر سکو۔

تمہارا دوست سکندر!

☆☆☆

ایک ہفتے بعد وہ وہاں پہنچا تھا اور قدرے پر اعتماد تھا۔

"آپ کو صاحب اندر بلاتے ہیں۔" ایک ملازمہ نے اس کے اندر بھجوائے پیغام کے جواب میں آ کر مژدہ دیا تو وہ حیران سا ہوا۔

ملازمہ کی رہنمائی میں وہ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ اندر صرف حیات خان صاحب تھے۔

"السلام علیکم۔"

"والسلام۔ بیٹھ جاؤ۔"

وہ تکلفاً ایک صوفے کے کونے پر ٹک گیا۔

"تمہیں یہاں ثانی کی فرمائش پر رکھا گیا ہے۔" انہوں نے ایک دم بات کا آغاز کیا۔ "میرا اپنا فیصلہ ہر چند کہ اس فرمائش کے قطعی برعکس تھا۔ لیکن ثانی کی بات ٹالنا میرے لئے ذرا مشکل ہے۔"

وہ خاموش بیٹھا ان کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا۔

"اس لئے بھی کہ وہ میری اکلوتی بیٹی ہے اور اس لئے بھی کہ وہ بیمار ہے۔" وہ رک کر بولے۔ سکندر نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"وہ کبھی کبھی دماغی دوروں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کی ذہنی کیفیات نارمل نہیں رہتیں۔ یہ سب کچھ میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تمہارا یہ سب کچھ جاننا اور یاد رکھنا ضروری ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں سر!" وہ مؤدبانہ انداز میں بولا۔

"اسی لئے میں چاہتا تھا کہ میں اس کے لئے ایک بااعتماد بڑی عمر کا تجربہ کار آدمی ڈرائیور رکھوں۔ مسئلہ یہ ہوا کہ اس نے تمہیں دیکھ لیا۔" انہوں نے قدرے بے کل ہو کر ادھر ادھر دیکھا۔ "اب جب تک اس کا دل تم سے بھر نہیں جاتا، تمہیں اس نوکری پر رہنا ہے۔ ثانی بہت جلد ہر طرح کے انسانوں سے اکتا جاتی ہے۔ وہ خطرناک نہیں ہے لیکن کبھی کبھی وہ تم سے بری طرح بی ہیو کر سکتی ہے اس بات کا خیال رکھنا۔"

وہ پریشان ہو چلا تھا۔ کہاں ایک سیدھی سادی سی جاب کا تصور اور کہاں یہ مشکلات۔

"اتنے پریشان مت ہو۔" انہوں نے اس پر نگاہ کی۔ "میں نے کہا نا وہ خطرناک یا

پاگل ہرگز نہیں ہے۔ بس کبھی کبھار اس کی دماغی رو بھٹک جاتی ہے اور وہ اپنے اردگرد موجود لوگوں سے بدتمیزی کر بیٹھتی ہے۔ اپنی مرضی کرتی ہے اور کوئی اسے سمجھا نہیں سکتا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ نوکری ختم ہو جائے تو فکر مت کرنا۔ اگر تم میری توقعات پر پورے اترے تو ثانیہ کے ریجیکٹ کر دینے کے بعد تمہیں آفس میں رکھ لیا جائے گا۔ میرا خیال ہے بات تم سمجھ گئے ہو۔''

''جی سر! میرا بھی یہی خیال ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''میں تمہیں پانچ ہزار روپے ماہوار دوں گا۔ اگر تم ان حالات کو جاننے کے بعد بھی پراعتماد ہو تو کہوں؟''

''جی سر! مجھے منظور ہے۔''

''ہوں! اب ایک آخری بات۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پائپ سلگا کر قدرے دور جا کھڑے ہوئے۔ ''نوکری کے پہلے دن تم نے ثانیہ کو اس کی مرضی کے مطابق گاڑی دے دی تھی اور وہ ایک معمولی سا ایکسیڈنٹ بھی کر بیٹھی۔ تم چونکہ اس وقت تک اس کی نفسیات سے لاعلم تھے اس لئے یہ غلطی قابل معافی ہے لیکن آج کے بعد تم اسے کسی بھی صورت میں گاڑی ڈرائیو نہیں کرنے دو گے۔ اس کی نہ اسے اجازت ہے نہ ملے گی۔ سمجھ گئے۔''

''جی سر!'' اس نے تھوک نگلا۔

''اور نہ تم اس سے ہماری اس ملاقات اور اس گفتگو کا ذکر کرو گے۔''

''بہتر سر۔''

''گڈ۔ آج میں محض تمہاری وجہ سے ایک گھنٹہ لیٹ ہو گیا ہوں۔'' انہوں نے گھڑی دیکھی۔

''تم اب انتظار کرو وہ سو کر اٹھتی ہو گی اس کا موڈ ہوا تو کہیں چلی جائے گی۔ ورنہ تم شام سات بجے گھر جا سکتے ہو۔ سات بجے کے بعد اسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''بہتر سر۔''

''اب تم جا سکتے ہو۔ باہر چوکیدار کا کیبن ہے تم وہاں بیٹھا کرو۔ ویسے تو یہ لڑکی روز ہی کہیں نہ کہیں نکلتی ہے لیکن پھر بھی یہ اس کے موڈ پر منحصر ہے۔'' وہ باہر نکل آیا۔

یہ سب باتیں جو اس سے کی گئیں اس کے لئے حیرانی اور قدرے پریشانی کا باعث

تھیں لیکن تنخواہ اس کے لئے کافی کشش رکھتی تھی۔ زندگی اور اس میں بری طرح سے ٹھن گئی تھی اور اب وہ ایک قدم بھی پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ گریجوایشن کا سال کسی بھی طرح سے مکمل کر کے اس نے بیرون ملک جا کر پیسہ کمانے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس مقصد کو پایۂ تکمیل پہنچانے کے لئے اسے کافی رقم کی ضرورت تھی یہ نوکری اسے امداد غیبی محسوس ہو رہی تھی۔ صبح گیارہ بجے سے لے کر شام سات بجے تک ایک قدرے کھسکی ہوئی لڑکی کو برداشت کرنا کچھ ایسا کوہ گراں بھی نہ تھا۔

''اور اگر یہ کوہ گراں بھی ہوتا تو شاید میں پیچھے نہ ہٹتا۔'' اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

دوسرے دن وہ آف وائیٹ کاٹن کے سوٹ پر چنا ہوا رنگین دوپٹہ اوڑھے باہر نکلی تھی۔ چمکیلی دھوپ میں اس کے کاندھوں پر بکھرے صحت مند بال آتشیں رنگ لئے ہوئے تھے۔

سکندر کو وہ اپنی گاڑی سے زیادہ اجلی اور چمکدار لگی۔

''السلام علیکم ثانیہ بی بی۔'' اس نے دروازہ وا کیا۔

''وعلیکم السلام۔'' اس نے شاید پہلی بار اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔

''کہاں لے چلوں؟''

''کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ کینٹ بازار لے چلو۔''

''وہ خاموشی سے ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور گاڑی ریورس کر کے باہر نکال لی۔

''کہاں رہے ایک ہفتہ؟''

''انیس بھائی کی شاگردی میں۔'' وہ زیر لب مسکرایا۔

''ہوں! کانفیڈنس کافی امپروو کیا ہے تم نے۔ اچھا دیکھو رائٹ سائیڈ پر لے لو۔''

''لیکن۔'' اس نے بتانے کے لئے منہ کھولا کہ مطلوبہ راستہ لیفٹ پر ہے۔

''میں جانتی ہوں یہ 'لیکن' اپنے پاس رکھو۔'' اس نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی۔ اس نے حکم کی تعمیل کی۔

''ڈیڈی نے تمہیں میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟'' وہ بڑے سکون سے بولی تھی۔

''جی...... '' وہ پریشان ہو گیا۔ ''کون ڈیڈی۔ میرا مطلب ہے جی' کچھ بھی نہیں!''

''احمق!'' وہ تلخی سے بولی۔

''کون میں؟''

''نہیں تمہارا۔ خاموشی سے گاڑی چلاتے رہو۔'' وہ جیسے بری طرح جھنائی تھی۔ بے مقصد ڈرائیو کرتے کرتے وہ بیراج پر آ چکا تھا۔

''ہاں۔ اب واپس لے لو۔'' اطمینان سے ہدایت دی گئی۔

گویا وہ محض دریا کی ایک جھلک دیکھنا چاہتی تھی جسے دیکھ کر اسے دلی سکون میسر آ گیا' پھر شاپنگ سنٹر میں وہ جا کر ایسی غائب ہوئی جیسے اب کبھی بھی باہر نہیں نکلے گی۔ وہ انتظار کی انتہائی تکلیف دہ صورت حال کا کئی گھنٹوں شکار رہا اور جب وہ محض ایک پیکٹ اٹھائے باہر نکلتی نظر آئی تو سکندر بخت کا اپنا سر پیٹ لینے کو جی چاہا۔

''ثانیہ بی بی۔ آپ!'' وہ بے بسی سے محض یہی کہہ سکا۔

''پاگل نہیں ہوں۔'' وہ سکون سے بولی اور پیچھے بیٹھ گئی۔ ''چلو اب گھر چلو!''

☆☆☆

اسے اپنا پرائیویٹ ایگزام کا فارم جمع کرانا تھا۔ دس بجے کے قریب وہ کالج سے لوٹ رہا تھا جب اس نے عندلیب کو دیکھا۔

سڑک کے کنارے پارک کی گئی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر وہ بڑے اعتماد سے اس لڑکے سے مصروف گفتگو تھی جو اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا۔

سکندر کو ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ صبح وہ خود اسے کالج جانے کے لئے بس میں بٹھا کر آیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ وہ کالج جانے کے بجائے کہیں اور گئی تھی بلکہ ایک قطعاً اجنبی شخص کی ہمراہی میں بھی تھی۔ سکندر کو مکمل یقین تھا کہ چچا میاں اور چچی جان بھی اس شخص کے وجود سے اتنے ہی لاعلم ہوں گے جتنا کہ وہ خود تھا۔

اس نے ایک فیصلہ کیا اور فٹ پاتھ پر چلتا پیچھے سے اس تک جا پہنچا۔

''عندلیب۔'' وہ اچانک ہی اس کی طرف کی کھلی کھڑکی پر جھکا تھا۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

اس کا چہرہ دھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا۔

''سکندر تم!''

''ہوں۔ میں ذرا کالج فارم جمع کرانے آیا تھا لیکن تم یہاں کیسے اور یہ صاحب کون

ہیں؟''

''یہ...... یہ۔'' اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

''یہی ہیں تمہارے کزن؟'' اس شخص نے انگریزی میں دریافت کیا تھا۔

''میرا خیال ہے تم ان کے ساتھ چلی جاؤ۔'' عندلیب کے سر اثبات میں ہلانے پر وہ

پھر گویا ہوا۔

وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر اتر آئی۔ گاڑی آہستگی سے آگے بڑھ گئی تھی۔ دونوں بنا

کوئی بات کیے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

''یہ صفدر تھے۔'' پھر بالآخر وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''میری فرینڈ نائلہ کے بھائی۔''

''اگر نائلہ بھی تمہارے ساتھ ہوتی تو زیادہ بہتر تھا۔'' وہ قدرے خشکی سے بولا۔

''ہمارے درمیان محض یہی ایک رشتہ نہیں ہے۔'' وہ پھر بولی۔ ''ہم ایک دوسرے کو پسند بھی

کرتے ہیں۔''

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کرنوں کے بجائے تیر برسا رہا ہو۔ رگ و پے میں زہر

سرایت کرنے لگا تھا۔ تمہیں اپنے ماں باپ کو اس بارے میں بتانا چاہیے تھا۔'' وہ دھیمی آواز میں

بولا۔

''میں جانتی ہوں یہ غلط ہے۔ لیکن فی الحال صفدر یہ نہیں چاہتے۔ ان کی کچھ پرابلمز

ہیں۔''

''جو کبھی حل نہیں ہوں گی۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''میں مرد ہوں عندلیب۔ مرد کی اس طرح

کی پرابلمز کو خوب سمجھتا ہوں۔''

''سکندر پلیز! تم صفدر کو میرے سامنے غلط نہیں کہہ سکتے۔'' وہ تیزی سے بولی پھر اس

کے انداز میں سابقہ نرمیاں لوٹ آئیں۔ ''میں انہیں کافی عرصے سے جانتی ہوں وہ غلط انسان

نہیں ہیں۔''

''بہرحال تمہارا ان سے ملنے کا طریقہ ضرور غلط ہے۔''

''ہاں ہاں۔ کہا ناں میں جانتی ہوں یہ غلط ہے لیکن محض وقتی بات ہے۔ صفدر جلد از جلد

اماں سے بات کریں گے۔ بات سنو سکندر۔ اس سے پہلے تم گھر میں کسی طرح کی ٹینشن مت پھیلانا پلیز!''

اس نے رک کر اس کی جانب دیکھا۔ چہرے پر اپنی وہی ازلی نرمیاں اور ملائمتیں لئے وہ بڑی آس سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

''عندلیب! دیکھو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' وہ بھی قدرے رسانیت سے بولا۔ ''اس بات کو چھپانا تمہارے لئے نقصان دہ ہوگا۔''

''اور اوپن کر دینا فوری طور پر تمہارے لئے فائدہ مند۔'' وہ تلخی سے بولی اور منہ پھیر لیا۔

وہ تکلیف دہ احساس سے دوچار ہوا اور کافی دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔

''میں نے تم سے کبھی کچھ مانگا نہیں عندلیب اور نہ میں اب خوش فہمیاں ہی پالتا ہوں۔ لیکن میرے بارے میں اگر تم یہ سمجھتی ہو تو خوش رہو میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔''

باقی کا تمام راستہ دونوں نے خاموشی سے طے کیا تھا۔

''یاور! میں شدت سے چاہنے لگا ہوں کہ میری پسندیدگی کے جذبات کسی طور ناپسندیدگی میں بدل سکیں۔ میں اسے ناپسند کروں اور بالآخر اس کی طلب سے بیزار ہو جاؤں۔ کاش کہ میں خطوط کی جگہ واسوخت لکھنے کے قابل ہوتا لیکن ہائے یہ ابلق بے لگام۔

یاور! دعا کرو میں اسے بھول جاؤں۔ اس کی اس بے تحاشا طلب سے بیگانہ ہو جاؤں اور اگر اب یہ طے ہی ہے کہ ہمارے راستے قطعاً جدا ہیں تو زندگی کے کسی موڑ پر مجھے اس کے وجود کی کشش آواز نہ دے۔ مجھے اس کی یاد سے کوئی واسطہ نہ رہے۔ دعا کرنا یاور!''

☆☆☆

پہلی تنخواہ اس نے چچی جان کے ہاتھ پر لا رکھی۔ اس کے دل و دماغ میں اس وقت کہیں کونے کھدرے میں بھی کوئی غلط خیال نہ تھا۔ نہ وہ انہیں شرمندہ کر دینا چاہتا تھا نہ کچھ جتانا اسے مقصود تھا اور نہ ہی وہ خود کو پانچ ہزار روپے ماہوار کمانے والا کوئی بڑی چیز تصور کر رہا تھا۔

اس کے دل میں تو کہیں دبی ہوئی وہی ان کہی تشنہ سی حسرت تھی۔ کوئی اسے اپنا سمجھے' اپنا کہے' اپنا کسی کا دست شفقت اس کے سر پر اپنا لمس چھوڑے اور وہ محبت کی حدتوں کو اپنے اندر اترتا محسوس کرے۔

''نہ بھئی۔ یہ تمہارا پیسہ ہے' تم ہی رکھو۔'' چچی نے روپے یوں اسے تھمائے جیسے ان کی حرارت ناقابل برداشت ہو۔

''لیکن چچی جان! کیوں؟'' وہ حد درجے حیرانی سے بولا تھا۔ ''کیا میں.... کیا میرا اس گھر پر کچھ حق نہیں؟ تھوڑا سا بھی نہیں؟''

''کیوں نہیں ہے حق۔ ہم نے کب تمہارے حقوق سے انکار کیا ہے لیکن یہ روپے میں نہیں رکھوں گی۔ کل کلاں کو تم کہو کہ چچا اور چچی نے پالنے پوسنے کی بھی قیمت وصول کر لی۔''

''میں؟ میں ایسا کہوں گا چچی جان؟ آپ' آپ یہ امید بھی کر سکتی ہیں مجھ سے؟''

''ارے بیٹا! تم پر کوئی الزام تھوڑا ہی دھر رہی ہوں۔ آج کل تو اپنی سگی اولاد بھی اپنی نہیں' پھر بھلا غیر سے کیا امید' کیا توقع؟'' انہوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''مجھے غیر سمجھتی ہیں چچی؟'' اس کا گلا رندھ گیا۔ ''میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں؟''

''اچھا چلو جھگڑا نمٹاؤ۔'' انہوں نے قدرے بے اعتنائی سے روپے اس کے ہاتھ سے لے لئے۔

''خدا مبارک کرے۔ خوب دے۔''

اپنی طرف سے تو وہ جھگڑا نمٹا کر باورچی خانے کی سمت چلی گئیں۔ لیکن وہ تادیر وہیں تخت پر بیٹھا رہا۔ احساس تنہائی اس کی رگ رگ میں کسی زہر کی طرح بھرتا چلا جاتا تھا۔ وہ جتنا دوسروں کے قریب آنے کی کوشش کرتا' دوسرے اس سے اتنی ہی دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ وہ اندر سے شکست و ریخت کا شکار ہو رہا تھا۔

☆☆☆

زندگی یونہی اپنی پرانی ڈگر پر رواں تھی' نوکری کرتے ہوئے اسے قریباً دو ماہ ہو گئے تھے نہ زندگی ہی تبدیل ہوئی تھی نہ انسان۔ سب اپنے اپنے رستوں پر رواں تھے۔

''سنو ڈرائیور!''

وہ اس کی ہدایت پر بیوٹی پارلر کی طرف گاڑی لئے جا رہا تھا۔ جب اچانک اس نے اسے مخاطب کیا۔

''جی ثانیہ بی بی کہئے!''

''تم نے کبھی بتایا نہیں۔ تم میرڈ ہو یا ان میرڈ؟''

''جی۔ ابھی تک تو ان میرڈ ہی ہوں۔'' وہ شگفتگی سے مسکرا دیا۔

''اچھا ذرا گاڑی روکو۔''

ایسے حکم وہ اچانک اور اکثر جاری کیا کرتی تھی۔ اس نے گاڑی ذرا کونے پر لے جا کر روک دی۔ وہ دروازہ کھول کر اتری اور گھوم کر فرنٹ سیٹ پر آ بیٹھی۔

''شش... ثانیہ بی بی۔'' وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''یہ.... کیا کر رہی ہیں آپ؟''

''گاڑی چلاؤ... فضول سوال کیوں کرتے ہو؟''

''آپ پلیز پیچھے بیٹھئے' کوئی آپ کو اس طرح دیکھے گا تو کیا کہے گا؟''

''یہی ناں کہ سیٹھ حیات خان کی بیٹی ثانیہ حیات خان اپنے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھی سیر و تفریح کر رہی تھی۔ سو واٹ۔''

''ثانیہ بی بی! پلیز!'' اسے کچھ نہ سوجھ رہا تھا۔ ''یہ آپ کا سٹینڈرڈ نہیں ہے۔''

''تم گاڑی سٹارٹ کرو میں اس سے آگے کچھ سننا نہیں چاہتی۔''

اسے محسوس ہوا' جن دماغی دوروں سے اسے روز اول سے خبردار کیا گیا تھا' آج ان کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''تم بہت اچھے آدمی ہو۔ میری ہر بات مانتے ہو۔'' وہ قدرے ممنونیت سے بولی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر اس کی سمت دیکھا۔

سیاہ گلاسز لگائے ہمیشہ کی طرح بال کھولے وہ ہمیشہ ہی کی طرح بڑی فریش اور خوبصورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے چمکدار' خوبصورت بال اس کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا اہم کردار ادا کرتے تھے۔

''سنو ڈرائیور! کسی کو پسند کرتے ہو نا؟''

''جی... ؟'' وہ سوال پر قدرے الجھا۔

پھر اس نے جلد ہی اپنی الجھن پر قابو پا لیا۔

"جی ہاں.. میں بہت سے لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ میرے گھر والے، میرے بہن بھائی۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"شاید تمہارا خیال میرے بارے میں یہ ہے کہ میں گھر میں فیڈر پی کر سوتی ہوں اور گڑیوں سے کھیلتی ہوں۔ ہوں !"

"میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں۔" وہ سنجیدگی سے سامنے روڈ پر نگاہ جمائے رہا۔

"تمہاری باتوں سے مجھے یہی لگتا ہے۔ مائنڈ اٹ مسٹر سکندر! میں بچی نہیں ہوں۔ میں نے پوچھا تھا کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو نا۔ میری مراد جیسا کہ تم کبھی بھی گئے تھے ایک عدد لڑکی سے بھی ایک لڑکی تمہارے خیالوں میں بسنے والے پیکر سے مشابہ اس کے لمبے لمبے بال ہوں گے لانبی پلکوں سے بجی آنکھیں ہوں گی اور جب وہ تم سے شرماتی ہوگی تو اس کے گال بیر بہوٹی ہو جاتے ہوں گے۔ تم نے کبھی ماچس کی ڈبیہ میں بیر بہوٹیاں اکٹھی کی ہیں؟"

وہ جواب دیئے بغیر ڈرائیونگ کرتا رہا۔ دراصل وہ اس کی بات سن کر کہیں کھو گیا تھا۔ کسی گزرے بیتے لمحے نے اس کی سوچوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ کر اپنے ہمیشہ کے لئے امر ہو جانے کا احساس دلایا تھا۔

سیاہ لباس پر خوبصورت چمکتے رنگوں کا پرنٹڈ دوپٹہ اوڑھے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ہونٹوں پر ہلکی گلابی لپ اسٹک اور لانبی پلکوں پر مسکارا کا بوجھ لئے اور سکندر کے نظر بھر کر دیکھ لینے سے اس کی نظریں جھک گئی تھیں اور گال بیر بہوٹی ہو گئے تھے۔

"آہ...... یہ تصورات، یہ پرچھائیاں!" ثانیہ نے گہری سانس بھر کر سر سیٹ سے ٹکا دیا تھا۔ وہ حال میں لوٹ آیا۔

"کبھی کبھی کسی کی خاموشی میں ہمارے ہر سوال کا جواب ہوتا ہے۔ ہے ناں سکندر!"

اس کے انداز تخاطب پر وہ شدت سے چونکا تھا۔ گردن موڑ کر اس نے دیکھا اس نے گلاسز اتار دیئے تھے اور اس کی بند پلکیں بھیگی ہوئی تھیں اور اس کے لب سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

"ثانیہ بی بی! آپ کی منزل آ گئی ہے۔"

اس نے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔

''منزل! کس قدر خوش کن لفظ ہے اور کتنا جھوٹا لفظ ہے۔'' وہ ہنس دی۔ ''منزل کس کو ملی ہے۔ تمہاری منزل کیا ہے سکندر؟ کیا وہی لڑکی؟''

''کون لڑکی بی بی صاحب۔'' وہ نرمی سے بولا۔ ''نجانے آپ کیا کہہ رہی ہیں؟''

''کیوں جھوٹ بولتے ہو؟'' وہ اداسی سے بولی۔ ''میں جان بھی لوں تو بھلا کیا کر لوں گی۔ چلو خیر۔ نہ بتاؤ تمہاری مرضی!''

''آپ اتریں گی نہیں؟''

''نہیں مجھے واپس لے چلو۔'' سیٹ سے اس کا سر ہنوز ٹکا ہوا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ اس نے خاموشی سے گاڑی سٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

''سنو !''

''جی ثانیہ بی بی! کہیں!''

''اس کا نام کیا ہے؟''

اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

''کیا وہ تمہیں پسند کرتی ہے شاید نہیں کرتی۔ ورنہ تمہاری آنکھیں اتنی اداس نہ ہوتیں۔ تمہاری عمر کے کسی لڑکے کو اگر کوئی لڑکی اپنی چاہتوں کا یقین دلائے تو وہ اتنا بجھا بجھا' اتنا اداس کبھی دکھائی نہ دے۔ خواہ غم دوراں کی شدت کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو۔''

آج وہ اسے بات بے بات چونکا رہی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی گہری بھی ہو سکتی ہے۔

''اداس مت رہا کرو سکندر۔ یہ محبت کا درد بھی بہت کم' بہت خوش نصیب لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ پھر زندگی کے باقی درد انہیں اتنی شدت سے محسوس نہیں ہوتے۔''

''ثانیہ بی بی۔...'' اس نے پہلی بار لب کشائی کی۔ ''عمر تو آپ کی بھی ایسی نہیں کہ آپ اتنی بڑی بڑی باتیں سوچیں۔ کیوں خود کو بے کار الجھاتی ہیں۔''

''میں تمہیں الجھی ہوئی لگتی ہوں؟'' اس نے ایک دم آنکھیں کھول کر پوچھا۔

''کبھی کبھی ....!''

''خیریت ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''میں تو ہمیشہ الجھی رہتی ہوں' کبھی خود سے' کبھی دوسروں

سے کبھی چیزوں سے کبھی سوچوں سے۔"

"حیرت ہے۔" وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ "آپ جیسے لوگوں کو بھی الجھنیں درپیش ہوتی ہیں؟"

"ہم جیسے ہی لوگوں کو تو الجھنیں درپیش ہوتی ہیں۔" وہ ہنس دی۔ "جو سوچتے ہوں محسوس کرتے ہوں' محبت کرتے ہوں' جیسی میں ہوں' جیسے تم ہو۔"

پھر اس نے دوبارہ سر ٹیک کر آنکھیں موندھ لی تھیں۔ باقی تمام راستے وہ یوں خاموش بیٹھی رہی جیسے پتھر کا بت ہو۔

سکندر کو اس دن وہ بہت مختلف لگی تھی۔

☆☆☆

وہ صبح حسب معمول گیارہ بجے گھر سے نکلا تھا۔ بس سٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے اس کو قطعاً علم نہ ہو سکا کہ ایک گاڑی اس کے تعاقب میں ہے۔

"سنئے مسٹر سکندر بخت!"

اس کے پیچھے جب گاڑی آ کر رکی اور کسی نے اسے مخاطب کیا تو وہ چونک کر مڑا۔ سفید کرولا کی ڈرائیونگ سیٹ پر صفدر بیٹھا' سر باہر نکالے اس سے مخاطب تھا۔

"جی...... جی فرمائیے!" نجانے کیوں اس کے سارے جسم میں کڑواہٹیں پھیل گئیں۔

"ایک کام تھا آپ سے' چند منٹ دیں گے مجھے آپ؟"

سکندر خاموشی سے اس کے برابر آ بیٹھا۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"دراصل چند باتیں ہیں جو میں عندلیب کے حوالے سے کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔ "یا یوں سمجھ لیں کہ میں عندلیب سے ہی کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس کا مزاج کچھ [illegible] گیا ہے کہ یہ سب کچھ اس سے کہہ ڈالنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ عندلیب نے مجھے آپ [illegible] میں بتایا تھا۔ وہ اکثر آپ کا ذکر کرتی تھی۔"

سکندر نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میرا خیال ہے جو بات میں کرنا چاہتا ہوں اسے سمجھنے کے لئے آپ بہترین شخص ہیں۔"

''عندلیب نے کیا بتایا تھا آپ کو میرے بارے میں؟''

''وہی ایک بات جو کہ بہت عام سی ہے۔'' وہ مسکرایا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بڑا سا اضطراب پوشیدہ تھا۔ ''اور عندلیب جیسی لڑکی سے اٹیچڈ ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں۔ شی از سم واٹ ڈیفرنٹ۔ یہی ڈیفرنس اس کی اٹریکشن ہے۔''

آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے؟'' اس نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔

عندلیب کی اس انداز سے تعریف اس کے لئے ناقابل برداشت تھی حالانکہ شاید صفدر وہ شخص تھا جسے خود عندلیب نے یہ حق بخشا تھا۔

''سکندر صاحب! یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ میں اور عندلیب...... وی آر ان لو۔'' اس کے لب اور مٹھیاں خود بخود بھینچ گئی تھیں۔

صفدر اس کی حالت سے بے خبر بولتا رہا۔

''لیکن ہمارے اسٹیٹس کا فرق ہمارے درمیان ہمیشہ سے حائل رہا ہے' اصل مسئلہ میرے پیرنٹس کا ہے۔ عندلیب انہیں بہو کے طور پر قطعاً منظور نہیں ہے میں نے کوشش کی' بہت کوشش کی کہ ہمارے درمیان موجود یہ رکاوٹیں دور ہو سکیں۔ ہم کسی طور پر یہ خلیج پاٹ سکیں۔ لیکن گزشتہ چار سالوں کی کوشش کے باوجود میں اس مقصد میں ناکام رہا ہوں۔ میرے پیرنٹس نہ صرف اس شادی کے مخالف ہیں بلکہ انہوں نے کوئی انتہائی قدم اٹھانے کی صورت میں مجھے عاق کر دینے کا فیصلہ بھی سنا دیا ہے۔''

دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔

''اور میں...... '' پھر اس نے ایک گہرا سانس بھرا۔ ''میں اب ہار چکا ہوں۔ میری عمر تیس برس کی ہے اور اب میں اس بات کی ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ میری ایک بیوی ہو' بچے ہوں' ایک پورا پیٹرن آف لائف ہو۔ اب یہ ٹین ایج والے کام اچھے محسوس نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ پہلی سی خوشی' وہ پہلا سا لطف ہی رہا ہے' چھپ چھپ کر ملنا' پیار و محبت کی باتیں کرنا' وعدے قول و قرار کرنا' ناؤ اٹ لکس نان سینس۔ لیکن عندلیب! وہ ہمیشہ اسی عمر میں رہنا چاہتی ہے جس میں ان تمام باتوں کا آغاز ہوا تھا۔ وہ اب بھی وہی سوچ رکھتی ہے' ذہنی طور پر وہ بہت پیچھے رہ گئی ہے اور میں بہت آگے نکل گیا ہوں۔ اب ہماری سوچوں میں توازن نہیں رہا اور میں سمجھتا ہوں اگر ہم اب

شادی کر بھی لیں تو ایک دوسرے کی کمپنی ہمیں وہ پہلی سی خوشی کبھی بھی نہیں بخش سکے گی۔"

"آپ محض اپنی بات کیجئے۔" وہ تلخی سے بولا۔ "اس معصوم لڑکی کو پیچھے ہٹنے کے جرم میں برابر کا شریک مت ٹھہرایئے۔"

"اوہ نو۔ تم غلط سمجھے ہو!" اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔ "میں گلٹی فیل نہیں کر رہا۔ وہاں نہ وضاحتیں دے رہا ہوں۔ جو کچھ میرے اندر ہے وہ سب صفائی سے بیان کر رہا ہوں۔ میں خود کہہ رہا ہوں کہ میں اتنی ہمت نہیں رکھتا کہ عندلیب کا ہاتھ تھامنے کے ساتھ ساتھ ساری عمر کی غربت اور ٹھوکروں کو بھی خوش آمدید کہوں۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں ایک پریکٹیکل سوچ بھی رکھتا ہوں۔ میں اپنے باپ کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ اپنے باپ کے آفس میں جی ایم کے چیمبر میں بیٹھتا ہوں۔ کہیں اور مجھے شاید اکاؤنٹینٹ کی کرسی بھی نہ ملے۔ تم سمجھ رہے ہو نا......"

"جی!" وہ گہرے طنز سے بولا۔ "میں سب کچھ صاف صاف سمجھ رہا ہوں۔ تم ایک امیر باپ کے عیاش صفت بیٹے، جس نے چند دن ایک معصوم لڑکی میں اٹریکشن محسوس کی، اس سے ملتے رہے، وعدے اور قول و قرار کرتے رہے اور اب جب کہ تم تیس برس کے ہو چکے ہو اور جبکہ تمہیں ایک بیوی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو محبوبہ کی اٹریکشن اس کے بیک گراؤنڈ کی بدصورتیوں میں گم ہو گئی ہے۔ اب تمہیں نہ اس کا ڈیفرنٹ ہونا یاد ہے نہ اٹریکٹو ہونا اب تمہیں یاد ہے تو محض جی ایم کا چیمبر اور اس چیمبر سے وابستہ ساری عمر کی آسائشات اور توقعات سو اب تم اس لڑکی سے کنارا کرنا چاہتے ہو۔ یہ سوچے بغیر کہ تم تو ذہنی طور پر آگے نکل گئے ہو لیکن وہ اب تک وہیں کھڑی ہے۔ یہ سوچے بغیر کہ بیوی کے نام پر تمہارا ذہن تو کسی بھی نئی خوبصورت اور امیر و کبیر خاندان سے تعلق رکھنے والی لڑکی کو خوش آمدید کہے گا۔ لیکن وہ شاید تم سے کم تر کسی شخص پر سمجھوتہ نہ کر سکے گی اور اس کی ساری زندگی ذہنی انتشار کا شکار ہو کر گزرنے گی اور یہ سب از خود کہنے اور اس کا سامنا کرنے کی ہمت تم میں نہیں ہے، اس لئے تم نے خوب سوچ سمجھ کر ایسے شخص کا انتخاب کیا جو خود بھی اسی معصوم سے محبت کا دعویٰ رکھتا ہے۔ تم نے سوچا ہو گا کہ میں یہ سب کچھ سن کر خوشی سے کھل اٹھوں گا اور اسے قسمت کی مہربانی سمجھ کر نہ صرف تمہارا شکریہ ادا کروں گا بلکہ اس کا ذہنی وجذباتی سہارا بننے کا وعدہ بھی کر لوں گا۔ کیا میں ٹھیک نہیں سمجھا مسٹر صفدر؟"

"چلو ... اگر ہماری بات اسی طرح سے ہے بھی تو کیا تمہیں یہ سب کہنا زیب دیتا ہے؟" تم کہنا مسٹر سکندر یہ سب کچھ سن کر نارسائیوں کا عذاب تمہیں ختم ہوتا محسوس نہیں ہوا؟ اپنے راستے کا کانٹا نکلتا دیکھ کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

"کھڑکی بند کرو اور گاڑی روک دو۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "افسوس مسٹر صفدر کہ میں تمہاری جیسی پریکٹیکل، دوسرے معنوں میں تاجرانہ ذہنیت نہیں رکھتا۔ میں خود سے وابستہ لوگوں کی خواہشات اور جذبات کا احترام کرنا جانتا ہوں۔"

وہ دروازہ کھول کر اترنے لگا۔

"سکندر صاحب! جو کچھ میں کہنا چاہتا تھا میں نے کہہ دیا۔ میں اب غالباً آپ سے کبھی بھی کہیں بھی نہیں ملوں گا۔ ہفتہ بھر بعد میری شادی ہے اور شادی کے تیسرے روز میں ہنی مون کے لئے باہر چلا جاؤں گا۔ اگر تم اس سے ابھی بھی محبت کرتے ہو تو اسے انتظار اور امید جیسی تکلیف دہ کیفیت سے بچانے کے لئے یہ سب کچھ اسی طرح سے سمجھانے کی کوشش کرنا۔"

سکندر نے ایک نفرت بھری نگاہ اس کے سرخ و سپید خوبصورت چہرے پر ڈالی۔

"یہ لیتے جاؤ۔" صفدر نے اس کے تاثرات کی پرواہ کئے بغیر ایک لفافہ اس کی سمت بڑھایا۔ "میں جب ہاسٹل میں رہتا تھا تو وہ مجھے خط لکھتی تھی۔ یہ اس کے محبت نامے اسے دے دینا ورنہ شادی کے بعد لڑکیاں عموماً اپنے ماضی کی ایسی نشانیوں سے خوف زدہ رہتی ہیں۔ یہ خطوط وہ اپنے ہاتھوں سے تلف کر دے گی تو اسے آئندہ زندگی میں کسی قسم کے خدشات نہیں ستائیں گے۔ تم تو خیر بہت بہترین شخص ہو لیکن ہو سکتا ہے اب بھی وہ تم سے شادی نہ کرے۔"

سکندر نے خاموشی سے لفافہ تھاما اور گاڑی سے اتر گیا۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو

'' یاور! جن سے عشق کیا جائے انہیں معمولی سی تکلیف دینا بھی پل صراط سے گزر جانے کے برابر لگتا ہے۔ پھر یہ اتنا بڑا دکھ اتنی شدید اذیت میں اسے کس طرح سے دوں؟ کیسے کہوں اس پیار محبت سے کہ اس کے پرفریب چارہ ساز اسے چھوڑ گئے ہیں اور اس کے ارد گرد ہجر اور تنہائی کا صحرا پھیلا ہوا ہے۔ میں خود کو نخل سایہ دار کیسے سمجھوں یاور۔ یہ اعتبار تو دوسرے دیا کرتے ہیں۔ اتنا معتبر تو محبتیں کیا کرتی ہیں۔ میں نخل سایہ دار بن بھی سکوں تو اس کی نظریں تو ہمیشہ سرابوں کی تلاش میں بھٹکیں گی۔ بہت کڑا وقت دل پر آن پڑا ہے۔ بتاؤ یاور! میں کیا کروں؟''

'' سنو عندلیب! ہر دستک پر چونکنا چھوڑ دو۔ تمہیں جس کا انتظار ہے اس کی راہیں کہیں مخالف سمت کو جاتی ہیں۔''

جوتے پہنتے ہوئے وہ بڑی آہستگی سے اپنی بات کہہ گیا تھا اور وہ جو نوالہ ہاتھ میں تھامے یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ باہر کون آیا ہے اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

'' کیا؟ کیا کہا تم نے؟'' اس نے نوالہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔

سکندر نے مڑ کر اسے دیکھا۔ زرد کاٹن کے ملگجے کپڑوں میں بکھری بکھری اور منتشر سی لگ رہی تھی۔ نہ آنکھوں میں کاجل تھا نہ بال بنے ہوئے تھے۔ اس کا وہ ادھورا روپ پوری طاقت سے اس کے حواسوں پر حملہ آور ہوا۔

بے چینی سے رخ موڑ کر وہ جوتے پہننے لگا۔

'' سنو سکندر! کیا کہا تھا تم نے؟'' اس نے بڑے تند لہجے میں پوچھا تھا۔

'' عندلیب! ہفتہ بھر پہلے مجھے صفدر صاحب ملے تھے'' اس نے آخر کار اسے بتا دینے کا تہیہ کر لیا۔

وہ اسے اس حالت انتظار میں دیکھ دیکھ کر خود بھی ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ اس کا پاگل پن کی حد تک بے قرار رہنا اسے بھی بے قرار رکھتا تھا' سو اس نے سب کچھ بتا دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

'' صفدر.... صفدر تمہیں ملے تھے۔ کیوں؟ کیا کر رہے تھے تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں تھا'' وہ جیسے پھٹ پڑی۔ '' تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی پریشان ہوں۔ پھر بھی تم چھپاتے

رہے، کیوں؟''

''سنو عندلیب! اس شخص کی خاطر پریشان ہونا چھوڑ دو۔ کل اس کی شادی تھی آج اس کا ولیمہ ہے اور کل وہ اپنی بیوی کے ساتھ جہاز میں بیٹھا ہنی مون کے لئے فلائی کر رہا ہوگا۔''

''جھوٹ...... بکواس بکتے ہو تم!'' اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ''صفدر ایسے نہیں ہیں۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ وہ ایسا کرتے تو کیا میں لاعلم رہتی اور تم ان کے اتنے قریب کیسے ہو گئے کہ یہ سب کچھ وہ تمہیں بتائیں اور مجھ سے چھپائیں۔ نہیں سکندر۔ تم محض اپنے نمبر بڑھا رہے ہو۔ تمہیں میسج کچھ اور دیا گیا اور تم نے اسے مرضی سے توڑ مروڑ دیا ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ انہوں نے تمہیں مجھ سے کیا کہنے کے لئے کہا تھا؟''

''ہونہہ...... تمہارا یقین کروں۔ مر کر بھی نہیں۔ تمہارے جیسے لوگ تو اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے نجانے کیا کچھ کر گزرتے ہیں۔''

''عندلیب!'' اس کے دماغ کی ساری رگیں تن گئیں۔

''مت لو میرا نام۔'' وہ جھٹکے سے اٹھی۔ ''میں خود معلومات کروں گی اور اگر تم جھوٹے نکلے تو میں تمہیں قتل کر دوں گی۔''

دل و جان کی تمام تر شکستگی کے ساتھ وہ بیٹھا رہ گیا۔ وہ چاہتا تو اس کے خطوط اس کے منہ پر مار کر اپنی بات کا ثبوت پیش کر سکتا تھا۔ لیکن وہ خط جو بڑی محبتوں، بڑے ارمانوں سے تحریر کئے گئے تھے اور جنہیں پڑھنے کی بد دیانتی اس نے دل کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہو کر کی تھی، ان خطوط کو وہ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ حفاظت سے سینت سینت کر۔ متاع حیات کی طرح سینے سے لگا کر وہ تاعمر ان خطوط کو اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ وہ عندلیب کے الفاظ تھے۔ اس کی سوچیں، اس کے احساسات، اس کے کومل جذبے تھے۔ جس پتھر کے دیوتا کو وہ بھینٹ چڑھائے گئے تھے اس نے تو حقارت سے انہیں ٹھوکر مار کر اپنے استھان سے گرا دیا تھا۔ وہ پجارن کا پجاری تھا۔ اس نے چپکے سے محبتوں کے وہ کومل پھول اپنے دامن میں اس طرح بھر لئے تھے کہ نہ دیوتا کو ہی خبر ہوئی نہ پجارن کو ہر چند کہ وہ پھول اور ان کی خوشبو اس کے لئے نہ تھی لیکن انہیں محسوس کرتے رہنے کا احساس ہی اس کے لئے بہت تھا۔

☆☆☆

"بی بی صاحبہ اندر بلا رہی ہیں۔"

ملازمہ نے اسے اطلاع دی تھی۔ اس نے کیپ سر پہ جمائی اور اٹھ کر اندر کی طرف چل دیا۔

پچھلے کئی دن سے ثانیہ کہیں جانے کے لئے نہیں نکلی تھی۔ وہ صبح سے شام تک بیٹھا رہتا اور ڈیوٹی ٹائم ختم ہو جانے کے بعد گھر چلا جاتا۔ حیات خان صاحب بیرون ملک گئے ہوئے تھے اور ملازمہ کے مطابق ثانیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سو کچھ دنوں سے وہ قطعاً فارغ رہتا تھا۔

ملازمہ ڈرائنگ روم کے بجائے اسے اندرونی حصے میں لے گئی اور کاریڈور کے انتہائی سرے پر واقع کمرے کے بند دروازے پر دستک دی۔

"آ جاؤ سکندر۔" اس کی آواز آئی تھی۔ "دروازہ کھلا ہے۔" اس نے پریشانی سے ملازمہ کو دیکھا۔

"یہ بی بی کا کمرہ ہے۔ وہ بلا رہی ہیں تو تمہیں جانا ہی پڑے گا۔ لیکن احتیاط سے ان کی حالت کچھ ٹھیک نہیں۔"

وہ سرگوشیوں میں بات مکمل کر کے پلٹ گئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا۔ وہ خواب گاہ تھی کہ خواہشوں کا طلسم کدہ۔ اس قدر حسین اتنی پرفسوں۔ وہ مسحور ہو کر رہ گیا۔

مرصع چھپر کھٹ' قیمتی پردے' نرم و گداز قالین چاروں جانب آئینوں میں نظر آتے عکس در عکس اور اس سے ٹکرا کر کمرے میں بکھرتی روشنیاں اسے چکر سا آ گیا۔

"سکندر......"

اس آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دیکھا' وہ صوفے سے ٹیک لگا کر نیچے قالین پر تقریباً نیم دراز تھی۔ وائٹ نائٹی میں ملبوس وہ زرد رو اور ذہنی خلجان کا شکار لگنے کے باوجود خوبصورت لگتی تھی۔ اس کے چمک دار بال اس کے کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

"ثانیہ بی بی! آپ نے یہاں کیوں بلایا ہے مجھے؟" اس نے رسانیت سے پوچھا۔

"کیوں...... کیا تم میرے دوست نہیں۔ آؤ یہاں بیٹھو۔"

"میں آپ کا ڈرائیور ہوں!" وہ اس کے انداز پر پریشان ہو اٹھا۔

"ارے دفع کر دیار۔ یہ ایک تو تم چھوٹے لوگوں کو یہ درجات کے بڑے کمپلیکس

ہوتے ہیں۔

''نہیں میں کچھ غلط کہہ گئی۔'' پھر وہ زور سے ہنسی۔ ''درجات کے کمپلیکس تو بڑے لوگوں کو ہوتے ہیں۔ میرے باپ سے ملے ہو ناں تم! کتنے بڑے آدمی ہیں' کتنے بڑے' دس بارہ فٹ کے تو ہوں گے ہی' ہیں ناں؟''

وہ ہنستی ہی چلی گئی۔ وہ اپنی جگہ سر جھکائے ساکت کھڑا رہا۔ ان حالات میں اسے کیا کرنا تھا۔ اسے قطعاً اندازہ نہ تھا۔

''اچھا سنو! یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔ پلیز پلیز سکندر! فار مائی سیک!''

وہ تذبذب کا شکار تھا۔ اس سے قدرے فاصلے پر جا بیٹھا۔

''اوہ! شاید تم سمجھتے ہو کہ میں پاگل ہوں' جنونی ہوں۔ میں سب کچھ ہوں لیکن یقین کرو خطرناک نہیں ہوں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''ثانیہ بی بی! چلئے میں آپ کو گھما لاؤں۔ آپ کی طبیعت بہل جائے گی۔''

''اب طبیعت بڑی ہو گئی ہے۔ اب وہ ان کھلونوں سے نہیں بہلتی۔'' وہ ہنسی۔ ''اچھا سنو تم یہاں سے جانا چاہتے ہو ناں' چلے جاؤ۔ بس ایک بار یہ بتا دو کہ اگر میں وہی لڑکی ہوتی تو تم اظہار محبت کیسے کرتے۔''

اس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا اور حلق خشک ہو گیا۔

''ڈرو مت۔ میں ڈیڈی سے کچھ نہیں کہوں گی۔''

''ثانی بی بی! ہوش میں آئیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''ارے ارے کہاں چل دیے۔ چند الفاظ ہی تو ہیں جو کہنے سے ڈر رہے ہو۔ ایک لمحے کو تصور کر لو کہ میں وہی لڑکی ہوں' تمہاری من پسند۔''

وہ مڑا اور تیزی سے باہر جانے لگا۔

''اوہ...... اوہ بزدل ڈرپوک۔'' وہ اچانک ہی بکھر گئی۔ ''بھاگ رہے ہو۔ کیا اس سے بھی یونہی بھاگتے ہو؟''

کرسٹل کا گلدان' سنگی مجسمہ' کشن' وہ ہاتھ میں آتی ہر چیز اسے اٹھا اٹھا کر مارنے لگی۔ وہ تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔

''اپنے صاحب کو فوری طور پر واپس بلوا لو۔'' اس نے ملازمہ سے کہا تھا۔ ''تائی بی بی کی حالت بہت خراب ہے۔''

اگلے پانچ دن وہ لوٹ کر وہاں نہیں گیا۔

☆☆☆

پانچ دن بعد وہ وہاں پہنچا تو ہر چیز نارمل تھی۔ کسی نے اس سے کسی قسم کی کوئی بات نہ کی۔ شام پانچ بجے سیاہ جینز اور بلیو ٹی شرٹ میں ملبوس باہر نکلی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''کہاں لے چلوں بی بی؟'' اس نے گاڑی باہر نکال لی۔

''دریا کنارے!'' سنجیدگی سے جواب آیا۔

پورے راستے وہ خاموشی سے بیٹھی باہر گزرتے مناظر دیکھتی رہی۔ دریا کنارے کا منظر بڑا اداس لگتا تھا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنوں نے ہر طرف اداسی بکھیر دی تھی۔

وہ باہر نکلی اور جا کر گیلی ریت پر بیٹھ گئی۔ وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹیک لگائے اس کی جانب پشت کیے کھڑا رہا۔

وہ اب جلد سے جلد یہ نوکری چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی پاگل تھا اور پاگل لوگوں سے اسے ڈر لگتا تھا اور یہ لڑکی تو اس کی سمجھ سے قطعاً باہر تھی۔

''سنو سکندر!''

پیچھے سے اس نے اسے پکارا تھا۔

وہ مڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

''ادھر آؤ......''

وہ اس کے قریب آیا۔

''بیٹھو......''

اس نے تعمیل کی۔

''جس لڑکی کو تم چاہتے ہو اس سے شادی کیوں نہیں کرتے؟''

سکندر نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اسے لگا سورج اس کی آنکھوں میں کہیں ڈوب رہا تھا

''آپ نے جسے چاہا تھا اس سے آپ کی شادی کیوں نہیں ہوئی؟'' اس نے نجانے کیوں پہلی بار براہ راست کچھ پوچھ لیا تھا۔

اس بظاہر بااعتماد اور بولڈ نظر آنے والی لڑکی نے یکبارگی نگاہیں چرائی تھیں۔

''سوال کا جواب سوال نہیں ہوتا۔'' پھر وہ کمزور لہجے میں بولی۔

''بعض اوقات ہوتا ہے۔''

اس نے گہرا سانس لیا۔

''اچھا! پھر میرے پاس پوچھنے کے لئے ایک اور سوال ہے۔''

سکندر نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''مجھ سے شادی کرو گے؟''

یکبارگی اس کے سر پر کئی دھماکے ہوئے' ارد گرد کا منظر اس کی نظروں میں پوری طرح گھوم کر رہ گیا۔

''جج..... جی!'' پھر وہ بولا۔ ''آپ کو احساس ہے آپ نے کیا کہا ہے؟''

''ہاں! مکمل احساس ہے۔'' وہ بولی۔ ''ایک بات کا یقین کر لو میں پاگل یا نکما نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں میرا ساتھ تمہیں کوئی خوشی نہیں بخشتا' لیکن اس سوال کا جواب تم پر ادھار ہے۔ چلو واپس چلیں۔''

واپسی کا سفر بھی خاموشی سے کٹا تھا۔

''تم پر کسی کا کوئی دباؤ نہیں ہے'' اترتے وقت وہ بولی تھی۔ ''اور نہ مجھ پر کوئی دباؤ یا پابندی ہے۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا لیکن دینا ضروری۔ مجھے تمہارا اقرار ہی نہیں' انکار سن کر بھی خوشی ہوگی۔''

وہ خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ مڑی اور کھٹ کھٹ کرتی اندر چلی گئی۔

☆☆☆

دوسرے دن سے اس نے جاب چھوڑ دی۔ اس کا دماغ پہلے ہی ہر وقت الجھا ہوا اور پریشان رہتا تھا اور وہ خود کو مزید پریشانیوں میں الجھانے کا خواہاں ہرگز نہ تھا۔ وہ کوئی پرسکون سا نوکری کرنا چاہتا تھا' جہاں سے واپس آ کر وہ گہری نیند سو سکتا تھا۔ ثانیہ حیات کی ہر روز کی نئی نئی

باتیں اسے نیند اور سکون سے دور کرتی جارہی تھیں۔ وہ اس بگڑی ہوئی امیرزادی کی پاگل پن کی باتیں سن سن کر اور اس کی عجیب و غریب حرکتیں سہہ سہہ کر خود بھی پاگل ہوتا جارہا تھا۔

اس کی پوری مہینہ بھر کی تنخواہ تھی۔ وہ اپنی تنخواہ لینے بھی نہ گیا۔ تین دن بعد ''حیات پیلس'' سے ایک ملازم آ کر اس کی تنخواہ بھی دے گیا۔ عندلیب کو دیکھ دیکھ کر اس کی کوفت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ غالباً اسے بھی اپنے سارے پر کٹ جانے کا مکمل احساس ہو چکا تھا۔ دن بھر وہ بے دم بے جان سی چڑیا کی طرح گھر کے کسی کونے کھدرے میں پڑی نظر آتی۔ گھر والے اس سے اس کی حالت زار کی وجہ پوچھ پوچھ کر تھک گئے تھے لیکن اس کی خاموشی ہر سوال کا جواب ہوتی تھی۔

وہ اس سے بات کرنا چاہتا۔ اسے تسلی دینے کے لئے مخاطب کرنا چاہتا لیکن نجانے کیوں اس کی ہمت ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ محض اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ جاتا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے بھرپور رات تھی۔ نہ اسے نیند آرہی تھی اور نہ دماغ ہی کسی نقطے پر ٹھہرنے کو راضی تھا۔ وہ کافی دیر کروٹیں بدلتا رہا' پھر اٹھا اور چپلیں پہن کر باہر نکل آیا۔

زینے پر ہوتی روشنی نے اسے چونکا دیا۔ چچی جان بجلی کے بل سے اس قدر خائف رہا کرتی تھیں کہ کسی کو رات میں زیادہ دیر تک جاگنے کی اجازت نہ تھی۔ مبادا دیر تک بلب جلنے سے بجلی کا بل دوگنا آ جائے۔

''سٹور روم میں کون ہے؟'' اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔

آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا وہ سٹور روم کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

اندر عندلیب موجود تھی۔ گندے فرش پر ننگے پاؤں بیٹھی وہ زار و قطار روئے جارہی تھی اس کے اردگرد صفحات بکھرے ہوئے تھے جنہیں وہ بڑی دلگیری سے اکٹھا کرتی' پڑھتی اور پھر بکھیرتی جارہی تھی۔ کافی دیر تک تو اسے سکندر کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو سکا۔ پھر اس نے آنسو پونچھتے ہوئے سر اٹھایا اور چند لمحوں کے لئے خوفزدہ ہو گئی۔

''تم.....'' پھر وہ بولی۔ ''تم کیا کرنے آئے ہو یہاں؟''

''یہی تو میں بھی پوچھنا چاہ رہا ہوں عندلیب!'' وہ نرمی سے بولا۔ ''تم اتنی رات گئے یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟''

''تمہیں یہ سب کچھ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' وہ زہرخند لہجے میں بولی۔ ''کیا نہیں

جانتے تم۔ سارا تماشا تو تمہارا آنکھوں دیکھا ہے' اس آگ کو کچھ ہوا تو تم نے بھی دی ہے۔''

''میں نے؟'' وہ حیرت سے منجمد ہو گیا۔ ''عندلیب! خدا گواہ ہے' میں نے اس سے ہمیشہ تمہاری خوشیوں کے لئے دعا کی ہے۔ میں تو تمہیں معمولی سی تکلیف دینے کا بھی نہیں سوچ سکتا۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم۔'' اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ ''تم... تم میرے دشمن رہے ہو سدا سے میری خوشیوں کے' تمہاری طلب میری خوشیاں نہیں' میرا وجود رہا ہے۔ تم جلتے رہے صفدر سے' مجھے اس کے ساتھ دیکھ کر جو دھند تمہاری آنکھوں میں اتری تھی' کیا وہ کسی بھی آنکھ رو کنے والے شخص سے پوشیدہ رہ سکتی تھی؟ جب تمہاری آنکھوں میں اتنی دھند تھی تو تمہارا دل کس قدر میلا ہو گا۔ پھر تم کیسے دعویٰ کر سکتے ہو کہ تم میری خوشیوں کے لئے دعا گو رہے؟ تم جلتے رہے سلگتے رہے اور تمہاری جلن' تمہارا حسد بالآخر مجھے تباہ کر گیا۔ اب تو خوش ہو نا تم؟ اب تو ٹھنڈ پڑ گئی ہو گی تمہارے جسم و جان میں۔ اب قرار مل گیا ہو گا تمہاری بے قراریوں کو۔''

''عندلیب!''

''مت لو میرا نام۔ نفرت کرتی ہوں میں تم سے۔ کھا گیا تمہارا حسد میرے نصیب کو۔ تمہیں دیکھتی ہوں تو آنکھیں جلنے لگتی ہیں میری۔ میرے قریب سے گزرتے ہو تو رواں رواں زہریلا ہو جاتا ہے۔''

''عندلیب! تم...... تم...... کیا کہہ رہی ہو؟'' دل اس قدر شدت سے دکھا کہ اس کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔

''ٹھیک کہہ رہی ہوں میں...... مجھے یقین ہے' پورا یقین ہے صفدر کو مجھ سے بد دل کرنے میں بھی تمہارا کچھ نہ کچھ ہاتھ رہا ہو گا۔ وہ تم سے ملا تھا' تم نے نجانے کس طرح سے اس کے کان بھرے ہوں گے۔ جو اس نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کر ڈالا۔ شاید تمہارا خیال یہ ہو کہ اتنی بڑی چوٹ کھانے کے بعد میں تمہاری جھوٹی ہمدردیوں اور مسیحائی کے فریب میں آ کر پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری گود میں آ گروں گی۔ لیکن کان کھول کر سن لو' میں مرنا پسند کروں گی' بہ نسبت تم سے کوئی تعلق قائم کرنے کے۔ میں شدید نفرت کرتی ہوں تم سے۔ نجانے خدا نے کیوں تمہیں ہمارے سروں پر مسلط کر دیا ہے' تم کہیں چلے جاؤ' کیوں نہیں جاتے' تم مر کیوں نہیں جاتے۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ پتھر کے بت کی طرح ساکن کھڑا تھا۔ شدت غم سے اس کی آنکھیں پھٹ رہی تھیں۔ یہ الفاظ پگھلا ہوا سیسہ۔ جتنے اس کی سماعتیں درد کی آخری حدوں سے گزر رہی تھیں۔ دل سے جیسے گرم گرم لہو پھوٹ کر اس کے سارے جسم میں بھر رہا تھا۔ اتنی نفرت' اتنا تنفر اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

وہ ایسا لمحہ تھا جب وہ ضبط کی تمام حدود کو پار کر گیا۔ اس کی قوت برداشت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔ سوچنے سمجھنے کی تمام تر صلاحیتیں مفقود ہو گئیں۔

وہ مڑا زینہ اتر کر نیچے آیا اور بیرونی دروازہ کھول کر گلی میں دوڑنا شروع کر دیا۔ نجانے وہ کتنی دیر تک دوڑتا رہا تھا۔ جب اس کی ٹانگوں کی ساری طاقت' جسم کی تمام توانائیاں ختم ہو گئیں تب وہ رکا۔

وہ "حیات پیلس" کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

کال بیل کا بٹن دبائے رکھنے پر چوکیدار نے آنکھیں ملتے ہوئے گھبرا کر منہ باہر نکالا تھا۔

"ثا...... ثانیہ بی بی کو جگاؤ۔" اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ "مجھے ان سے فوراً ملنا ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"ثانیہ بی بی! آپ نے ایک سوال کیا تھا۔ جس کا جواب مجھ پر ادھار تھا۔"

سفید نائٹی میں ملبوس گلابی آنکھیں! کر اپر جمائے وہ بڑی حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے آپ کا وہ پرپوزل قبول ہے۔" وہ کسی تھکے ہوئے' سب کچھ ہارے ہوئے جواری کی طرح صوفے پر گر پڑا۔

☆☆☆

پورا کمرہ گلابوں کی مہک سے بھرا ہوا تھا اور اس مہک کے درمیان اپنا مہکتا وجود لئے وہ اس کے مقابل تھی لیکن سکندر بخت کا تصور کہیں اور بھٹک رہا تھا۔

"سنو سکندر!" اس نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ "اتنا مت سوچو ورنہ میری طرح پاگل کہلاؤ گے۔"

''ثانیہ! ایک بات بتائیں۔'' اس نے کہیں بھٹکی ہوئی نگاہیں اس کے چہرے پر جمائیں۔

''یہی ناں کہ یہ فیصلہ میں نے کیوں کیا تھا؟'' وہ ہنسی۔

''جی ہاں۔ یہی پوچھنا چاہتا ہوں میں!''

''میں نے سوچا سکندر۔ شاید دو ادھورے وجود مل کر ایک مکمل بھرپور وجود بن سکیں۔'' وہ کچھ سوچ کر افسردہ ہو گئی۔

''کس کو چاہتی تھیں آپ؟''

ثانیہ نے گلابوں پر سے نظریں ہٹا کر اس کے چہرے پر جمائیں۔

''میرا کلاس فیلو تھا۔''

پھر ایک اضطراب کے عالم میں وہ اٹھی اور کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی اور وہ کتھارسس چاہتا تھا۔ اپنا بھی اور اس کا بھی۔ سو وہ اٹھا اور اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔

''کیسا تھا وہ؟'' بڑی آہستگی اور نرمی سے اس نے پوچھا تھا۔

''بہت اچھا' بہت نیک' بہت شریف۔ وہ دنیا کا سب سے خوبصورت انسان تھا۔'' اس کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔

''میں ایک بگڑی ہوئی امیرزادی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ انسان کیسا ہونا چاہئے۔ اس نے مجھے انسان کی عزت کرنا سکھائی' چھوٹے بڑے کو ایک نظر سے دیکھنا سکھایا۔ وہ ایک کلرک کا بیٹا تھا اور ان کے گھر میں دو وقت کی روٹی بھی بڑی دقتوں سے کمائی اور کھائی جاتی تھی۔ لیکن نہ اس نے میرے باپ کی دولت سے مرعوب ہو کر مجھے سجدہ کیا اور نہ میرے حسن نے اس کا ایمان ایک لمحے کے لئے بھی کمزور کیا۔ وہ ناقابل تسخیر تھا۔ اس کے حوصلے ناقابل شکست تھے۔ بہت اچھا' بہت عظیم تھا وہ۔''

''پھر شادی کیوں نہ کی اس سے؟''

''اس لئے کہ اس وقت مجھے دماغی دورے نہیں پڑتے تھے اور اس لئے کہ اس وقت میرے لئے وڈیروں اور جاگیرداروں کے بیٹوں کے رشتے موجود تھے اور اس لئے کہ اس وقت میرے باپ نے جھکنا نہیں سیکھا تھا۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''وہ چاہتا تو مجھے بھگا لے جاتا اور اسے

بھری محفل میں ذلیل کرنے والے میرے باپ سے بھرپور انتقام لے لیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے میرے باپ کو اپنے باپ کی جگہ سمجھا اور خاموشی سے اپنی کزن سے شادی کر لی۔''

''تب سے یہ دورے پڑنے لگے؟''

وہ اس کی جانب دیکھ کر استہزائیہ ہنس دی۔

''دورے! نہیں سکندر، مجھے دورے نہیں پڑتے۔ میں پاگل ہوں نہ دماغی مریض کیونکہ دماغی مریض کو تو شور مچاتے ہوئے چیزیں توڑتے ہوئے احساس نہیں ہوتا ہوگا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟''

''اور آپ کو احساس ہوتا ہے؟'' اس نے غایت درجہ کی حیرت سے پوچھا۔

''آپ...... آپ جان بوجھ کر کرتی رہیں یہ سب کچھ؟''

''ہاں...... ہاں سکندر۔ اس دنیا کے خلاف اتنا زہر بھر گیا تھا میرے اندر کہ اسے نکالنے کا یہ ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا میرے پاس۔ جب ڈیڈی میری وجہ سے پریشان پھرتے، ڈاکٹرز کی لائن لگا دیتے، بیرون ملک دورے کرتے تو میری روح بہت ہلکی ہو کر کھلی فضا میں پرواز کرتی۔ ٹھیک ہے ایک محاذ پر ڈیڈی نے مجھے شکست دے دی کہ میرے اپنے حلیف ان کے طرفدار ہو گئے تھے۔ لیکن سکندر میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اگر شادی کی، کسی کو اپنا بنایا تو وہ شخص میرے ہی معیار کا ہوگا، ڈیڈی کے معیار کا نہیں اور دیکھو یہ جنگ میں جیت گئی۔'' اس کی شفاف آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

''میں جانتی ہوں، میں جانتی ہوں کہ یہ شادی محض ایک سمجھوتہ ہے تمہارے لئے بھی اور میرے لئے بھی۔ نہ میں عارفین کو بھول پاؤں گی اور نہ تم اس بیر بہوٹی کو۔ لیکن یہ ایک بہتر راستہ ہے۔ دو غموں کے ہارے افراد ایک دوسرے کا سہارا بن کر جی سکتے ہیں۔ زندگی کی کٹھن، پرخار راہ کچھ آسان ہو سکتی ہے۔

میں جانتی ہوں، میں کبھی بھی تمہارے لئے اس کا نعم البدل نہیں بن پاؤں گی۔ تم میری آنکھوں میں اس کی آنکھیں، میری باتوں میں اس کے لفظوں کو کھوجو گے لیکن میں کوشش کروں گی کہ اس تلاش میں تم تشنہ نہ رہ جاؤ۔ آج سے قبل مجھے کبھی بھی تم سے محبت کا دعویٰ نہیں رہا کہ تمہاری طرف بڑھنے کی واحد وجہ عارفین کی وہ شبیہہ تھی جو تمہاری ایک ایک ادا سے جھلکتی تھی لیکن آج کے بعد میں تم سے محبت کروں گی اس رشتے سے محبت کروں گی جو میرے اور تمہارے بیچ بنا ہے اور تم

بھی کوشش کرنا کہ ایسا کر سکو!"

اس کے سو جانے کے بعد سگریٹ سلگا کر وہ کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔
نفرت کا ایک الاؤ تھا جو اس کے سینے میں دہکتا تھا۔ ایک سوچ تھی جو نفرت کی آگ سے جھلس کر زہرباد بن گئی تھی اور اب اس کی رگ رگ میں زہر دوڑتا تھا۔
زندگی بھر کا ناسور بن گئے تھے وہ الفاظ:
"میں شدید نفرت کرتی ہوں تم سے ...... نجانے خدا نے کیوں تمہیں ہمارے سروں پر مسلط کر دیا ہے۔ تم کہیں چلے کیوں نہیں جاتے! تم مر کیوں نہیں جاتے۔"
اس کی آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا۔ کانوں سے دھواں نکلنے لگتا۔
"یاور! تم سے ایک دعا مانگنے کی درخواست کی تھی' نجانے تم نے مانگی یا نہیں لیکن یاور میری وہ دعا ازخود قبول ہو گئی ہے۔ میں' میں زندگی کے آخری موڑ پر بھی اس کی صورت دیکھنے کا روادار نہیں ہوں۔ اس نے میری نہیں' میری محبتوں کی توہین کی ہے۔ مار ڈالا ہے اس نے میری چاہتوں کو' خون کر دیا ہے اس نے میری وفاؤں کا۔ میں ...... میں نفرت کرتا ہوں اس سے اسی کی طرح۔ شدید نفرت!"

☆☆☆

"سکندر! یہ کیا ہوا؟" عرصے بعد اس سے مل کر وہ حیران تھا۔ "تیرا خط تو ساری مصروفیات چھوڑ کر میں دوڑا چلا آیا۔ یہ یہ سب کیا ہے؟"
"میں نے لکھا تھا نا یاور! یہ سب نفرت ہے میرے اردگرد اس کی نفرتیں بکھری ہوئی ہیں اور میرے اندر میری نفرتیں بھری ہوئی ہیں۔"
"نہیں سکندر نہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے' تو اسے قدر چاہتا تھا' عبادت کرتا تھا اس کے تصور کی۔ پھر پھر یہ کایا پلٹ کیسے؟"
یاور ......!" وہ رو دیا۔ "اس نے مجھے نہیں میری محبتوں کو ذلیل کیا' پامال کر دیا میری عقیدتوں کو قدموں تلے کچل دیا' میری نیازمندیوں کو۔ یاور! کسی کی عزت نفس ایک بہت بڑی

حقیقت رکھتی ہے۔ اس نے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر کے ایسی ٹھوکر لگائی میری رہی سہی انا کو کہ اب تک اپنے وجود کے ریزے ریزے مجھے ہواؤں میں بکھرتے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ناقابلِ برداشت حد تک تکلیف دہ تھا۔ نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ اب جاؤ اور ان سے ملو تو کہہ دینا کہ وہ سکندر بخت جو ذلیل تھا' حقیر تھا' بے قیمت تھا' وہ سکندر بخت اب اتنی اونچی جگہ کھڑا ہے کہ اسے دیکھنے کی کوشش میں ان کی گردنیں ٹوٹ جائیں گی۔ چچی سے ملو تو انہیں بتانا کہ پانچ ہزار روپے ماہوار کمانے والا وہ ڈرائیور آج پانچ لاکھ روپے ماہوار کماتا ہے۔''

''سکندر!'' یاور کو افسوس ہوا۔ ''یہ باتیں' یہ ذہنی سطح' یہ تیرا تو شیوہ نہ تھا۔''

''مر گیا ہے وہ سکندر' فنا ہو گیا ہے۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''اس سکندر کا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ آج کا سکندر شہر کے سب سے امیر ترین شخص کا داماد ہے اور اس کے کاروبار کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے رہا ہے اور اس کی بیوی حسن و جمال میں انداز نشست و برخاست میں بے مثال ہے۔ وہ جاہل سی لڑکی اس کے قدموں کی دھول کے برابر بھی نہیں۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔ ''محبتیں وقتی طور پر دل و دماغ کی جنگ میں کہیں بھول بھلیوں میں گم ضرور ہو جایا کرتی ہیں لیکن مرتیں نہیں۔ تم مرتے دم تک اسی جاہل لڑکی سے محبت کرتے رہو گے۔''

''میں اس سے نفرت کے سوا کوئی دوسرا جذبہ اپنے دل میں نہیں پاتا یاور۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''خدانخواستہ کہیں اس سے ٹکراؤ ہو گیا تو اسے بتاؤں گا ضرور اور میری خواہش ہے کہ یہ ٹکراؤ مرتے دم تک نہ ہو۔''

یاور ہولے سے ہنس دیا۔

''میں بہت مصروف ہو گیا ہوں یاور۔ نجانے اگلے چند سال مجھ میں مزید کیا تبدیلیاں لائیں لیکن دوست ملتے رہنا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں کسی عزیز دوست کے مر جانے کا دکھ تھا اور کاندھے اس کے نادیدہ جنازے کے بوجھ سے جھکے ہوئے تھے۔ وہ مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا باہر نکل گیا۔

زندگی اس طرح سے اپنے محور پر رواں دواں تھی کہ وہ خود کو بھی بھول گیا تھا۔ اس میں

کتنی صلاحیتیں چھپی ہوئی تھیں اسے خود کو خبر ہوتی تو وہ چند لمحوں کے لئے حیران رہ جایا کرتا تھا۔
حیات خان صاحب تک بھول چکے تھے کہ وہ کیا تھے اور کس طرح سے ان کی اکلوتی بیٹی کی زندگی میں داخل ہوا تھا۔ سکندر کو شادی سے پہلے کے ان کے الفاظ یاد تھے۔ انہوں نے کہا تھا:

''میں نہیں جانتا کہ یہ تمہاری اپنی پلاننگ کا نتیجہ ہے یا محض تمہاری خوش قسمتی لیکن بہرحال یہ طے ہے کہ تم میرے داماد بننے جا رہے ہو۔ اپنی بیٹی کے متعلق میں تمہیں پہلے ہی تفصیل سے بتا چکا ہوں۔ اگر تم بے پناہ دولت مند بننے کے شوق میں ایک جنونی' پاگل لڑکی کے ساتھ ساری زندگی گزار سکتے ہو تو تمہاری مرضی۔ میں تو اپنی سی ہر کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں اور مجھے یقین ہے وہ نارمل نہیں ہو سکتی اور چونکہ وہ میری ایک ہی بیٹی ہے' میری اکلوتی وارث ہے اس لئے اس کی اس حالت کے پیش نظر اس کی ہر بات کو مان لینا میری مجبوری ہے اور میں تمہیں تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود اپنا داماد بنا رہا ہوں۔'' وہ تھوڑی دیر تک اسے تاسف سے دیکھتے رہے تھے۔ ''بڑی خواہش تھی میری کہ میرا ایک ویل ایجوکیٹڈ' ویل فنڈ' ہائی اسٹیٹس سے تعلق رکھنے والا داماد ہوتا جس کے ساتھ اپنی اکلوتی بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا۔ بٹ ناؤ آئی ایڈمٹ۔ تدبیر کبھی کبھی تقدیر کے سورج کے سامنے ایک ذرے کی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس سے تو بہتر تھا آج سے کچھ برس پیشتر میں نے یہ بات تسلیم کر لی ہوتی۔ کم از کم وہ نارمل تو ہوتی۔''

اور آج حیات خان صاحب اپنی کہی بات بھول کر بڑی خندہ پیشانی سے پیش آیا کرتے' لوگوں سے اس کا تعارف اپنے داماد کی حیثیت سے کراتے ہوئے ان کے چہرے پر بڑی خوبصورت چمک ہوتی کہ وہ ان کے لئے درحقیقت سکندر بخت ثابت ہوا تھا۔ ان کی اکلوتی' لاڈلی بیٹی اس سے وابستہ ہو کر بالکل نارمل ہو چکی تھی اور ایک بہترین ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ ان کا کاروبار ترقی کی شاہراہ پر تیز روی سے گامزن تھا اور ان کی ایک بے حد پیاری انہیں توتلی زبان میں ''نانا جان'' کہنے والی نواسی ان سے اپنے سارے لاڈ پورے کروانے کے لئے دنیا میں آ گئی

تھی۔

☆☆☆

پچھلے ماہ ثانیہ اور رانیہ کے ساتھ شمالی علاقہ جات کے ٹور سے لوٹا تھا۔ ثانیہ صحت مند ہو کر مزید دلکش ہو گئی تھی اور رانیہ نے اب بالکل صاف زبان میں باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔

''سکندر!'' رانیہ کو اب سکول کی ضرورت ہے...... ہے ناں۔'' ثانیہ اسے دلیہ کھلا رہی تھی۔

''نہیں ثانی...... بچوں کو چند سال تو بالکل بچہ بن کر جی لینے دیں۔ ابھی سے ان پر کاپیوں' کتابوں اور بستوں کا بوجھ نہ ڈالیں۔''

اس نے جھک کر رانیہ کا گال چوما۔

''یہ بگڑتی جا رہی ہے۔ ڈیڈی اور تم نے مل کر اسے بہت سر چڑھالیا ہے۔ میری تو کوئی بات نہیں مانتی یہ......''

''دیکھیں۔ میری پیاری بیٹی کو کچھ مت کہا کریں۔ جب ہم سب مل کر اسے پیار کرتے ہیں اس کی شرارتوں پر ہنستے ہیں' اس کی فرمائشیں پوری کرتے ہیں تو مجھے ایک خاص ذہنی سکون محسوس ہوتا ہے' بچوں سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے ان کا بچپن ان سے چھین لینا بہت بڑی ناانصافی ہے۔''

''لیکن بچوں کو تمیز سکھانی بھی ضروری ہے۔'' اس نے احتجاج کیا۔ ''بے جا لاڈ کر کے انہیں معاشرے کا ناکارہ اور ناپسندیدہ فرد بنانا کہاں کا انصاف ہے؟''

''اس کے لئے گورنس رکھ دیں۔ لیکن فی الحال سکول نہیں۔'' اس نے فیصلہ سنایا اور ہاتھ دھونے کے لئے اٹھ گیا۔

ثانیہ کا دور کا کوئی کزن ان کے یہاں چند ماہ سے مقیم تھا۔ وہ دن بھر رانیہ کو اٹھائے پھرتا۔

''جی...... گورنس کی ضرورت نہیں۔ میں جب تک یہاں ہوں' اسے میری بیٹی سمجھ لیں۔ ہم اسے آپ کو تنگ نہیں کرنے دیں گے۔''

''بہت چالاک ہے میری بیٹی!'' ثانیہ بھی مسکرا دی۔

"ہر کسی کو اس نے اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے۔ پھر بھلا اس نقار خانے میں میری آواز کس نے سنی ہے۔"

"درست کہتی ہیں آپ!" اس نے مسکرا کر اسے ہوا میں اچھالا اور باہر لے گیا۔

"سکندر! اشتہار دے دو اخبار میں گورنس کے لئے۔ میں واقعی اس کی طرف سے فکر مند ہوں۔"

"ڈونٹ وری۔" وہ بریف کیس بند کر کے مسکرایا۔ "ہمایوں راضی تو ہو گیا ہے اس کام کے لئے۔ آپ اپنے کزن سے ہی تنخواہ وغیرہ طے کر لیں۔"

"سکندر! پلیز! بی سیریس!"

"او۔ کے ڈیئر۔" وہ اس کا گال تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

برسوں بعد وہ اس سے ملنے آیا تھا۔ سکندر نے اگر چشمہ نہ لگا رکھا ہوتا تو یقیناً اسے پہچاننے میں دشواری محسوس کرتا۔

"کیسے ہو یاور۔" وہ گرمجوشی سے بغل گیر ہوا تھا۔

"فضل ہے خدا کا۔" وہ مسکرایا۔ "تمہارا حال نہیں پوچھوں گا۔ ایک ایک ادا سے عیاں ہے۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ پھر اس نے اپنی سیکرٹری کو کافی لانے کا آرڈر دیا اور دونوں ہر کام بھلا کر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ نجانے کتنی یادیں تھیں جو وقت کی راکھ کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ انہیں کرید کرید کر نکالنے میں انہیں وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

"سکندر......" اپنی زندگی کے بارے میں بتاتے بتاتے وہ اچانک بولا تھا۔ "پچھلے سال تمہارے چچا میاں کا انتقال ہو گیا ہے۔"

"اوہ......" وہ چند لمحوں کے لئے سن ہو گیا۔

"تمہارے گھر والے بڑی کسمپرسی کے عالم میں ہیں۔"

"میرے گھر والے؟" وہ تلخی سے بولا۔ "خدا انہیں زمانے کے سرد و گرم سے محفوظ رکھے۔ میری بیوی، میری بچی، یہی میری متاع حیات ہے۔"

"ٹھیک!" یاور کچھ دیر کو خاموش ہو گیا۔ "تم نے دائمی خوشی کا فارمولا ڈھونڈ لیا ہے۔ پرانی، گزری باتوں کو فراموش کر دینا، خوش رہتا ہے انسان۔ ویسے تمہاری چچی تمہیں اکثر یاد کرتی

ہیں۔ آصف اور واصف کی نااہلی اور نالائقی کو دیکھ کر تم انہیں شدت سے یاد آتے ہو۔''

نجانے وہ سخت افسردہ ہوا تھا یا یہ بات اسے خوشی بخش گئی تھی۔ اسے خود اپنی کیفیت سمجھ میں نہ آئی۔

''تمہاری کزن مجھ سے کہہ رہی تھی کہ اسے کوئی چھوٹی موٹی نوکری دلوا دوں تاکہ ان کے گھر کا خرچہ چل سکے۔''

''یاور پلیز! چینج دا ٹاپک۔''

''او۔کے۔'' وہ دوسری باتیں کرنے لگا۔

لیکن اس کی دوسری باتیں بھی سکندر کا دھیان اس کی پہلی باتوں کی طرف سے نہ ہٹا سکیں۔

''میں بہت مادیت پسند لڑکی ہوں۔ فی الوقت متوسط طبقے سے تعلق ضرور رکھتی ہوں لیکن آئندہ زندگی اس سے برتر طبقہ میں گزارنا چاہتی ہوں۔ اس سے مزید نیچے آنا میرے لئے ناممکن ہے۔''

بیتے لمحوں کے چند سائے اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گئے۔ ایک زہر خند مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کرلیا۔

''غالباً تم میری بات نہیں سن رہے۔'' یاور نے اسے مخاطب کیا۔ ''اب تم اپنے بزنس کے بارے میں اکیلے میں سوچو۔ میں اب چلتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''سنو یاور!'' وہ اسے سی آف کرنے آفس کے مرکزی دروازے تک آیا۔ ''میری بیٹی کے لئے ہمیں ایک گورنس کی ضرورت ہے۔ اسے کہنا کہ سیلری منہ مانگی مل سکتی ہے۔'' یاور پتھر کا بت بن کر اسے دیکھنے لگا۔

''سکندر!'' پھر وہ بمشکل بولا۔ ''تم... تم...... چاہو تو اسے اپنے آفس میں کسی مناسب جگہ پر رکھ سکتے ہو۔''

''میں اسے مناسب جگہ پر ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔'' تلخی سے اس کا پورا وجود کڑوا ہو گیا۔

''تم چاہو تو اسے مت بتانا کہ اس بچی کا باپ کون ہے' میرا اس سے سامنا ہونا زیادہ ممکن بھی نہیں اور یوں بھی ضرورت مند لوگ ایسی باتوں کو نظر انداز ہی کر دیا کرتے ہیں۔''

''خیر! اس کی مرضی ہے وہ اگر چاہے تو یہ جاب اس کی منتظر ہے۔ ہو سکتا ہے وہ اسے ایک ''چھچھورا جاب'' کہہ کر ریجیکٹ ہی کر دے۔''

وہ ہولے سے ہنس دیا۔ یاور نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ کی گرفت سے آزاد کرایا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

''سکندر! آج ایک لڑکی آئی تھی عندلیب!''

کافی کا کپ لبوں تک لے جاتے ہوئے وہ درمیان میں ہی رک گیا۔

''کہہ رہی تھی کسی صاحب نے گورنس کی جاب کے لئے ہمارا پتا اسے دیا تھا۔''

''یہ تو کافی پرانی بات ہے۔'' پھر وہ بے نیازی سے کافی پینے لگا۔ ''اسے اب خیال آیا ہے؟!''

''کہہ رہی تھی کہ اس کی ماں راضی نہیں تھی لیکن اب گھریلو حالات کی وجہ سے مجبور ہو گئی ہے۔ بڑی ضرورت مند لڑکی ہے بھی بہت پیاری اور نفیس طبیعت۔ پھر بھی میں نے کہا کہ انٹرویو میرے ہسبینڈ لیں گے۔ تم کل ذرا لیٹ آفس جانا پلیز۔ میں نے اسے نو بجے کا ٹائم دیا ہے۔''

''ثانی..... ان تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے نیپکن سے منہ صاف کیا۔ ''اگر آپ اس سے مطمئن ہیں تو میں بھی مطمئن ہوں اور پھر اگر وہ ضرورت مند بھی لگتی ہے تو مزید کیا پوچھنا۔ رکھ لیجئے اور ہاں سیلری ذرا زیادہ دیجئے گا ایڈوانس دے دیں۔''

''تم جانتے ہو اسے؟'' ثانیہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

''جن صاحب نے اس کی سفارش کی ہے میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔'' وہ بات ختم کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔

''ہاں..... ہاں آج احساس ہوا ہے نفرت کے اس کھیل میں میں نے تمہیں بری طرح سے شکست دی ہے مس عندلیب احمد!''

رات کو اس نے اپنے دریچے سے جھانکتے ہوئے سوچا تھا۔

''تمہارا سارا غرور، گھمنڈ، ناز میرے قدموں تلے ہے۔ ایک معمولی ملازمہ ہو میرے

گھر میں۔ وہ تمہارے ہائی سٹیٹس کے خواب سب چکنا چور ہونے۔ نجانے تمہیں یہ احساس ہے یا نہیں کہ کسی کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچانا خود انسان کو کس مقام پر لا سکتا ہے۔'' سگریٹ کے گہرے کش لے کر اس نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔

''عندلیب احمد! رانیہ سکندر بخت کی گورنس!'' وہ تلخی سے مسکرایا تھا۔

''ڈیڈی! آنٹی بہت سویٹ ہیں وہ مجھے اچھی اچھی باتیں سکھاتی ہیں۔'' رانیہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام کر اپنی طرف کیا۔

''اچھا۔'' وہ مسکرایا۔ ''مثلاً کیا سکھاتی ہیں وہ ہماری بیٹی کو۔''

''ڈیڈی! وہ کہتی ہیں سارے انسان برابر ہیں۔ ہمیں سب سے محبت کرنی چاہئے۔ ہمیں سب سے نیک برتاؤ کرنا چاہئے۔'' اس نے رٹا رٹایا سبق دہرا دیا۔

''یہ برتاؤ کیا ہوتا ہے ڈیڈی؟''

''یہ برتاؤ ہی تو سب کچھ ہوتا ہے میری جان۔'' اس نے اس کی پیشانی چومی۔ ''یہ برتاؤ' انسان کی عظمت اور اس کا وقار ہے۔ اس برتاؤ کا بڑا خیال رکھنا چاہئے۔ سمجھیں؟''

''جی......!'' اس نے سر ہلایا۔

اور وہ اس کی معصومیت پر مسکرا دیا۔

پچھلے تین ماہ سے وہ یہ نوکری کر رہی تھی اور اب تک اس نے شکایت کا معمولی سا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ ثانیہ اس سے بہت خوش تھی بلکہ اس نے تو اچھی خاصی دوستی بھی کر لی تھی اس سے۔

''بہت نفیس' بہت شائستہ لڑکی ہے سکندر۔ کبھی تم بھی ملو ناں!''

''مجھے اتنا وقت کہاں۔ صبح جا کر رات کو لوٹتا ہوں۔ کاروبار سنبھالنا' بچن سنبھالنے سے کہیں مشکل ہے۔'' ثانیہ اسے گھور کر رہ گئی۔

اس کی روح اب بہت پرسکون ہو گئی تھی۔ نفرت کے جو الاؤ دن رات بدن میں دہکا کرتے تھے اب ان پر طمانیت کی پھوار برسا کرتی تھی۔

یہی۔ یہی چاہا تھا اس نے' اس گھر سے نکلتے وقت یہی مانگا تھا خدا سے کہ جو سر غرور اور تنفر سے تنا ہوا تھا' زندگی میں کبھی ایک بار وہ اسے جھکا ہوا دیکھ سکے۔ وقت نے اس کے سارے بدلے چکا دیئے تھے۔ سارے حساب بے باق ہو گئے تھے۔

''اور وقت سارے بدلے چکا دیتا ہے۔ سارے حساب بے باق کرتا ہے۔ یہی قانون قدرت ہے۔''

رات کے اندھیرے میں وہ دریچے میں کھڑا ہو کر سوچا کرتا۔

''سکندر! ایک عجیب سی نیوز ہے۔'' وہ لندن میں تھا۔ جب ثانیہ نے اسے فون پر اطلاع دی۔

''ہاں ہاں کہیں..... میں سن رہا ہوں۔''

''اپنا ہمایوں ہے نا..... وہ عندلیب میں انٹرسٹڈ ہے۔'' لائن پر خاموشی چھا گئی۔

''سکندر..... سکندر سن رہے ہوناں؟''

''آں.....'' وہ حواسوں میں لوٹا۔ ''کیا کیا کہا آپ نے؟''

''ہمایوں عندلیب کو پسند کرنے لگا ہے۔ رانیہ کی گورنس کو۔ شادی کرنا چاہتا ہے اس سے۔ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں آنٹی حشمت سے بات کروں۔''

''ثانیہ..... آپ کو اس مسئلے میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔'' اس کے لہجے میں سختی در آئی۔

''ہمایوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بہت فرق ہے ان لوگوں کے سٹیٹس میں۔''

''سکندر۔'' ثانیہ کو حد درجہ حیرت ہوئی۔ ''سٹیٹس کا ڈیفرنس تمہارے لئے بھی اہمیت رکھتا ہے؟''

وہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

''آپ طنز کر رہی ہیں؟'' پھر وہ بولا۔

''بائی گاڈ نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''لیکن مجھے تمہاری زبان سے یہ سن کر شاک لگا ہے۔ سکندر، وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ پریٹی اینڈ نائس۔ وہ ضرورت مند ضرور ہے لیکن اس کا تعلق کسی اچھے خاندان سے لگتا ہے۔''

''ثانیہ! آپ کو اس کے خاندان تک جانے کی ضرورت نہیں۔'' وہ جھنجھلا گیا۔ ''میں آؤں گا تو اس مسئلے پر مزید بات ہو گی۔'' اس نے ریسیور پٹخ دیا۔

''یہ..... یہ کیسے ممکن ہے۔'' وہ بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اسے اس مقام پر دیکھنے کے لئے کتنا انتظار کرنا پڑا ہے مجھے اور ایک بار وہ پھر میرے برابر پہنچ رہی ہے۔ ایک بار پھر وہ مجھ

سے نظریں ملا کر بات کرنے کے قابل ہو جائے، یہ کیسے ممکن ہے۔ نہیں وہ اپنی اصل جگہ پر ہے۔ یہی اس کا اصل مقام ہے۔ یہاں سے ایک سٹیپ بھی وہ اوپر آسکے، مجھے منظور نہیں۔" وہ بے چینی سے ٹہلتا رہا، سوچتا رہا۔

"ہمایوں پاگل ہو رہا ہے۔ آنٹی حشمت کبھی نہیں مانیں گی۔ وہ صفدر کی ماں سے کچھ کم تو نہیں۔" چلتے چلتے اس کے قدم تھم گئے۔

"صفدر!"

ایک نام ذہن کی تہوں سے نکل کر نوکیلے کنکر کی طرح سوچوں کے پاؤں زخمی کرنے لگا۔

"جاؤ عندلیب بیگم! ساری عمر اس ایک نام پر گزارو، یہی سزا ہے تمہاری۔" ہمایوں جیسے امیر و کبیر خاندان کے چشم و چراغ سے شادی کر کے تم میرے ہم پلہ شخص کی بیوی بنو۔ ناممکن میں مر کر بھی ایسا نہیں ہونے دوں گا نیور۔"

☆☆☆

"سکندر! آخر اس میں حرج کیا ہے؟" وہ زندگی میں پہلی بار اس سے ناراض ہوئی تھی۔

"جی سکندر بھائی! مجھے بھی تو بتائیں، اس مسلسل انکار کی وجہ؟" ہمایوں زچ بیٹھا تھا۔

"میں تو فون پر ممی سے بات کر چکا ہوں، وہ کہتی ہیں ثانیہ اور سکندر مطمئن ہوں تو انہیں بھی اعتراض نہیں۔ سکندر بھائی جس انکار کی توقع مجھے ممی سے تھی وہ آپ کی جانب سے کیوں ہے؟"

"دیکھو ہمایوں! بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ رسانیت سے بولا۔ "جس طبقے سے اس کا تعلق..."

"مجھے اس سے غرض نہیں، میں اس کی انوسینس سے، اس کی پیورٹی سے متاثر ہوا ہوں۔ وہ کمال لڑکی ہے۔ اب اس کا تعلق کس طبقے سے ہے، مجھے اس سے غرض نہیں۔"

"میں تمہیں یہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں ہمایوں، کہ جتنا انوسینٹ اور جتنا پیور تم اسے سمجھ رہے ہو، ہو سکتا ہے یہ تمہاری خام خیالی ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

"مطلب یہ کہ..." الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ خیر میں یاور سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ وہ اگر مطمئن ہوا تو مجھے بھی اعتراض نہ ہوگا۔" اس نے جھوٹ بول کر بات بدل دی۔

نجانے کیا بات تھی! جو کچھ وہ اس کے بارے میں کہنا چاہتا تھا' کہہ نہیں سکا۔ کس جذبے نے بے اختیار دل سے بلند ہو کر زبان کا راستہ روکا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پایا اور الجھ کر وہ وہاں سے اٹھ گیا۔

لیکن اندر جو کشمکش مسلسل جاری تھی' اسے وہ دبانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے سامنے کا غذاب بکھرے ہوئے تھے' صفحات ہی صفحات جن پر وہ الفاظ تحریر تھے۔ جنہیں ایک مدت اس نے اپنی متاع کل سمجھ کر سینت سینت کر رکھا ہے' وہ لفظ جو اس کے لئے نہ تھے' پھر بھی ایک زمانے میں وہ انہیں پڑھ کر اپنی تشنہ کامیوں کو سیراب کرنے کی ناکام کوشش کیا کرتا۔

یاور نے اسے اس کا بیگ لا کر دیا تھا تو اسی کے کونے کھدرے میں پڑے یہ خطوط بھی ساتھ چلے آئے تھے اور جنہیں اس نے نفرت کے الاؤ کو وقت بر وقت بھڑکانے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔

مدت سے یہ خطوط اس کی الماری کی ایک دراز میں مقفل تھے۔ شاید جس روز کے منتظر تھے' وہ آن پہنچا تھا۔

یاور کا نام لے کر یہ خط وہ ہمایوں کو دینا چاہتا تھا۔ اتنا بھروسہ اسے عندلیب احمد کی سچائیوں پر تھا کہ وہ کبھی بھی جھوٹ بول کر ان سے غیر وابستہ ہونے کا دعویٰ نہ کرتی۔ پھر ہمایوں جیسا انوسینس اور بیوٹی کا دلدادہ کیسے اسے مزید التفات کی نگاہ سے دیکھ سکتا تھا۔

خطوط کو سامنے رکھے وہ سوچتا رہا' مسکراتا رہا۔

"عندلیب احمد! محبتوں پر تو تمہارا ایمان لا نہ سکے' اب تمہیں یہ ضرور بتائیں گے کہ نفرت کیسے کی جاتی ہے۔"

گاڑی میں اس نے اپنا بریف کیس کھول کر دیکھا تھا اور پھر اس کا موڈ شدید آف ہو گیا تھا۔

"ڈرائیور! واپس گھر چلو۔" وہ بڑی ضروری فائل بھول آیا تھا۔

"بہتر سر......" ڈرائیور نے گاڑی اگلے موڑ سے واپس موڑ لی۔

وہ گھر آیا تو ثانیہ دوبارہ سونے کے لئے جا چکی تھی اس کا قاعدہ تھا کہ وہ سکندر اور رانیہ کے ساتھ ناشتے میں شریک ہو کر ایک بار پھر نیند لیتی تھی۔ اس نے الماری سے فائل برلیف کیس میں رکھی اور باہر نکل آیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا' جب اس سے ٹکرایا۔

عندلیب کے ہاتھوں سے کتابیں نکل کر سیڑھیوں پر بکھر گئیں۔ دونوں ایک ساتھ بیٹھے تھے اور پھر وہ مجسم رہ گیا تھا۔

وہی نقش' وہی ملاحتیں' وہی نرمیاں' وہی اجالے۔ سکندر پتھر کا بت بنا اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کتابیں اکٹھی کرتی رہی۔ غالباً وہ رانیہ کے لئے لائی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ وہ چونکی تھی اور نہ گھبرائی تھی۔ گویا اسے ہمیشہ سے علم تھا کہ جس بچی کی وہ گورنس ہے اس کا باپ کون ہے۔ کتابیں اکٹھی کر کے وہ کھڑی ہوئی تو وہ بھی کسی سحر سے آزاد ہو کر آہستہ آہستہ کھڑا ہوا۔

"کیسے ہو سکندر؟"

وہی آواز تھی جسے سننے کے لئے وہ اس سے بلاوجہ مخاطب ہوا کرتا تھا۔

"میں......" وہ آگے خاموش ہو گیا۔

وہ ہولے سے مسکرائی اور سائیڈ سے ہو کر آگے نکل گئی۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ وہ مسکراہٹ یادوں کے کتنے باب کھول گئی تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے سے ایک ایک کر کے کتنے منظر گزرے پھر وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

"یہ لڑکی...... جو مانند صبا ابھی پاس سے یوں گزری ہے جیسے یادوں کی معطر خوشبو ہو۔ میرا اس لڑکی سے کیا رشتہ ہے؟" اس نے رک رک کر' ٹھہر ٹھہر کر خود سے پوچھا تھا۔"

"کیوں ہر نگاہ نے اس کے نقش یوں چومے ہیں جیسے برسوں بعد کوئی بھٹکا ہوا مسلم کعبہ میں جا نکلے۔ کیوں ہر سانس نے اس کا سواگت یوں کیا' جیسے تپتے صحراؤں میں باد نسیم کا پہلا جھونکا وارد ہوا ہو۔ کیوں دل کے خالی سیپ نے اس لمحے کو صدف بنا کر خود میں محفوظ کر لیا ہے۔ کیوں' کیوں' کیوں!"

اس نے ریلنگ سے سر ٹکا دیا۔ دماغ کے کسی گوشے میں یاور کی آواز گونج رہی تھی۔

"محبتیں وقتی طور پر دل و دماغ کی جنگ میں کہیں بھول بھلیوں میں گم ضرور ہو جایا کرتی ہیں لیکن مرتی نہیں۔ تم مرتے دم تک اسی لڑکی سے محبت کرتے رہو گے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ

گئے۔

"کیا میں اس سے نفرت کرتا رہا ہوں۔"

"نہیں...." کوئی بولا۔ "وہ نفرت نہیں تھی بے وقوف۔ تنہائیوں کے عذاب کے خلاف لاشعور کی معمولی سی مزاحمت تھی!"

"کیا رشتہ ہے میرا اس سے؟"

"محبت...... محبت۔ ...محبت۔" وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگا۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکون کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے!
تری مسرت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا
ہجوم یاس سے بے تاب ہو کے رہ جائے
وفور درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرور حسن سراپا نیاز ہو تیرا
کہ جس عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے
فریب وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ تیرے لئے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

سورج کی ڈھلتی کرنوں سے دریا کا پانی نارنجی ہو رہا تھا اور اس اداس اور بے کیف منظر میں سکندر بخت بیٹھا ایک ذیلا گواہ ان کے سپرد کر رہا تھا۔